جلد ۹۰ نومبر ۱۹۷۸ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

۷۴۲۲ء منتخب ترین احادیث نبوی پر مشتمل

عظیم الشان کتاب

الجامع الصحیح

از

امام مسلم

کی

وسیع پیمانے پر اشاعت

مکمل عربی متن مع اسنادِ حدیث

- جدید رواں اردو زبان میں ترجمہ
- قدیم اور جدید علماء کی آراء پر مشتمل جامع حواشی

از **پروفیسر عبدالحمید صدیقی**

جدید تعلیم یافتہ طبقہ، قانون دان حضرات اور علمائے دین کیلئے

۱۲۰۰ سے زائد ابواب اور ۳۰۰۰ سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب چھ جلدوں میں شائع ہوگی

انشاء اللہ تعالیٰ ہر جلد نہایت خوبصورت [illegible] ہر حصہ ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔

ہمارا پروگرام [illegible] بھی ہے اور خریداروں کیلئے آسانی بھی ہے

مزید تفصیلات کیلئے

رحمٰن پبلشنگ کمپنی — ۵ بلال سٹریٹ، اچھرہ، لاہور ۱۶

فون نمبر ۹۵۲۵۲۰۹ [illegible] فارم کیلئے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	نومبر ۱۹۷۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ	جلد ۹۰

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک ۔ اچھرہ ، لاہور

فون نمبر ـــــ ۴۱۱۰۱۶ ـــــ ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بیس روپے ۔ /فی پرچہ ۲/۰۰ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر :۔ محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پوری تاریخ گواہ ہے کہ تفرقہ خاندانوں، اداروں، کاروباری وحدتوں، قوموں، جماعتوں اور سلطنتوں کی بربادی کا باعث بنتا ہے۔ قرآن نے بھی اس گواہی پر اپنی مہرِ توثیق ثبت کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو گروہِ واحد کی حیثیت میں دیکھنا پسند کرتا ہے، اور زمین پر انسانی زندگی کا ابتدائی دَور، جبکہ حضرت آدم، حضرت حوّا اور ان کی تیزی سے پھیلتی ہوئی اولاد ہی تک انسانی معاشرہ محدود تھا، صحیح معنوں میں وحدت کا دَور تھا۔ اس میں پہلا رخنہ قابیل کے جرمِ قتل سے پیدا ہوا۔ قرآن مجید میں ابتدائی دَورِ وحدت کا ذکر موجود ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

—— انسان پہلے پہل امۃً واحدہ ہی تھے۔

—— پھر یہ بات محذوف چھوڑی گئی، جو آیت کے اگلے حصے سے واضح ہو جاتی ہے کہ: اس وحدت انسانی کو نزاعات و اختلافات نے مجروح کر دیا۔

—— پھر اللہ نے وقتاً فوقتاً بشارت سنانے اور انتباہ دینے والے انبیاء کو کتابِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کو حل کر دیں۔

—— اور کتابِ حق کے مخاطب لوگوں ہی نے آپس کی دراز دستیوں کی بنا پر علمِ حق حاصل ہو جانے کے بعد اختلاف کیا۔

—— اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کو اپنے اذن سے ہدایت دے کر ان اختلافات

سے نکالا جو وہ حق کے معاملے میں رکھتے تھے۔

معلوم ہوا کہ سلسلۂ بعثتِ انبیاء (علیہم السلام) کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ انسانوں کو حق کے بارے میں اختلافات سے نکال کر متحد کریں، نیز یہ کہ ایسے اختلافات سے نکلنا خدا کی طرف سے ہدایت دیے جانے کی نشانی اور ایمان کی ایک علامت ہے۔

آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں خدا کے رشتے کو تھامنے اور تفرقہ سے بچنے کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہربانی اور نعمت ہے کہ مومنین کے قلوب ایک دوسرے سے اس حد تک وابستہ ہوں کہ وہ بھائی بھائی بن جائیں۔ اور قرآن میں جگہ جگہ مسلمانوں کو دوسرے مسلمان کا بھائی کہا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ۱۰۴ میں امتناعی حکم دیا گیا ہے کہ آپس میں تفرقہ پیدا نہ ہونے دو اور بیّنات کے آجانے کے بعد اُن پر نگاہیں مرتکز رکھنے کے بجائے اختلافات میں نہ پڑو۔ بصورت دیگر عذابِ عظیم کا خوف دلایا گیا۔ آیت ۱۰۵ میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا کہ وہاں جب کچھ چہرے روشن اور کچھ کلونسے ہوتے ہوں گے، یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ یہاں آیت ۱۰۴ سے متصل اس آیت میں کفر کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق اختلاف و تفرقہ سے ہے۔ بات ختم اس پر ہوئی کہ اب عذاب کا مزہ چکھو۔

ان آیات کے بیچ میں آیت ۱۰۴، اور اس کے بعد پھر آخر میں آیت ۱۱۰ میں مسلمانوں کو اس نصب العین کی طرف توجہ دلائی گئی جو اگر فکر و عمل پر چھا جائے تو چھوٹے چھوٹے اختلافات اتنا زور نہیں پکڑ سکتے کہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان دیواریں کھڑی ہو جائیں۔ اس مقام پر تو یہ بتایا گیا کہ تمھیں ایک جماعت بنا کر کھڑا اس مقصد کے لیے کیا گیا ہے کہ تم پوری انسانی دنیا کے سامنے معروف کا حکم دینے اور منکر سے باز رکھنے کے لیے نکلو۔ یعنی تمھاری ساری توجہ اسی مقصدِ اعلیٰ کی طرف رہے اور جو کوئی بھی اس بین الانسانی مقصد کا خادم ہو تم اس کے ساتھ اخوت کا رشتہ رکھو، تم سب کے سب اپنے آپ کو اسلام کی ہدایت کے مطابق نیکی کو قائم کرنے اور بدی کا قلع قمع کرنے والا ایک خدائی لشکر (حزب اللہ) سمجھو، اور اس لشکر کے سپاہی دل سے دل اور کندھے سے کندھا ملا کر بنیان مرصوص بن جائیں، مختلف اقوام اور خاندان اور نسلیں آ آکر اس کی رجمنٹیں بنتی جائیں۔ آخر اتنا عظیم نصب العین رکھتے ہوئے تمھیں موقع کیسے ملتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے مفاد

اور جاہلانہ عصبیتوں اور علمی نکتہ آرائیوں پر دھڑے بنا نے پھرو۔ تم تو میدانِ جنگ میں ہو۔
الانفال کی آیت نمبر ۴۶ میں خدائے برتر نے خبردار کیا کہ سیدھی طرح اللہ اور اس کے رسولؐ
کی اطاعت کرو۔ آپس میں نزاعات و اختلافات نہ اٹھاؤ۔ ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور
رعب داب سب ختم ہو جائے گا۔ پھر غزوۂ احد میں ظاہر ہونے والی کمزوریوں پر تنقید کرتے
ہوئے بتایا کہ ہماری طرف سے تمہیں مدد پہنچ گئی تھی مگر تم نے اس کا مشاہدہ کرنے کے باوجود
اختلاف کیا، تم پراگندہ ہوئے، تم نے نافرمانی کی اور ہم نے اپنی تائید کو کچھ دیر کے لیے
ہٹا لیا۔ تاکہ تم ایک لمحۂ آزمائش کا مزا چکھو۔

آیات کے علاوہ احادیث میں اس موضوع پر بہت سی رہنمائی موجود ہے۔ احادیث
میں مسلمانوں کی محبت باہمی (جس کا معیار قرآن نے اخوت مقرر کیا ہے) کو لازمۂ ایمان قرار
دیا گیا ہے (لا تؤمنوا حتی تحابوا) اس مقصد کے حصول کے لیے تمسخر، تنابز بالالقاب،
اسم الفسوق، غیبت، نجویٰ، بہتان، بغض، کینہ، حسد، تدابر و تجسس جیسے مفاسد کو ممنوع
قرار دیا گیا ہے۔ یہ احتیاط اتنی باریکی تک جاتی ہے کہ بیکار کی بحثا بحثی ناپسندیدہ ہے، ایک
شے کی خریداری کے لیے بیک وقت دو مسلمانوں کا بہ طور گاہک کے حریف و متقابل ہونا اور جہاں
ایک مسلمان نے نکاح کا پیغام دیا ہو وہاں اس کے مسترد ہونے سے پہلے دوسرے مسلمان کا
پیغام بھیجنا حضورؐ کی تعلیم کے خلاف ہے۔

غزوۂ بنی مصطلق کے سفر میں منافقین نے مہاجرین کے خلاف انصار میں عصبیت جاہلی
کی آگ بھڑکانا چاہی، مگر خدا کے رسولؐ نے حکمت و موعظت سے اسے بجھا دیا۔ نیز ہمیشہ کے
لیے کسی طرح کی عصبیتِ جاہلیہ کا علم اٹھانے اور نعرہ لگانے اور اس کی بنا پر کوئی معرکہ لڑنے
سے اُمت کو روک دیا۔ سرکارِ رسالت مآبؐ کا فرمانا تو یہ ہے کہ عصبیتِ جاہلیہ کے علمبردار
ہم میں سے نہیں، یعنی اُمتِ محمدیہ کے اساسی تصور ہی سے منحرف ہیں۔

میں نے ان چیزوں کو سامنے رکھ کر جب بھی غور کیا تو میرے دل پر یہی حقیقت آشکارا

ہوئی کہ حضورؐ دنیا میں ایک طرح کا نظامِ اخوت قائم کرنے آئے تھے — دینی اخوت، سیاسی اخوت اور معاشرتی اخوت! اور اسی کے ساتھ میرے ذہن پر یہ راز بھی کھلا کہ وہ وحدتِ اہلِ ایمان و اسلام جس کے بارے ہی خدا نے حضورؐ سے فرمایا کہ آپ اگر تمام کی تمام دولت ارضی کو خرچ کر کے اس کے بل پر چاہتے کہ لوگوں کے دل ایک ہو جائیں تو ایسا نہ ہو سکتا، یہ جو ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے ہوا ہے۔

پس میں وحدتِ اُمتِ محمدیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث اور آپؐ کی طرف سے امانت سمجھتا ہوں، جس کا تحفظ و استحکام ایک ایک مسلم کا عمومی اور قائدین، علماء اور دانشوروں کا خصوصی فریضہ ہے۔ جس نے اس فریضے میں کوتاہی کی اس کی گرفت تو اپنی جگہ، آخر ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جن کی سرگرمیوں کا ماحصل ہی وحدتِ ملت کے قلعے میں نت نئے شگاف پیدا کرنا، تازہ بتازہ جتھے اور ٹولیاں بنانا، مسجدیں اور مدرسے اور مناکحتیں الگ کرنا اور عامۃ المسلمین کو اشتعال دلا دلا کر آپس میں لڑانا ہے۔ ہمارے نبیؐ محبوب محبت کے نقیب تھے، اور جانشینانِ رسول نفرتوں کے مبلغ ہیں۔

کلامی اور فقہی بنیادوں پر وعظوں، تقریروں، بیانوں کا طوفان رہ رہ کر اُٹھانے والوں کی توجہ سب سے بڑے کام کی طرف نہیں جاتی کہ وہ عامۃ المسلمین کے سامنے بھی اور خاص طور پر اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے سامنے بھی اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کی تلقین کرنے کے ساتھ معاملاتی اخلاق کی تباہی کا ازالہ کرنے کے لیے کام کریں۔ سچے خدا پرستوں کو درد ہونا چاہیے اس بات کا کہ جھوٹ اور وعدہ خلافی، غیبت اور بہتان طرازی، قیمتوں میں ناروا زیادتی اور ماپ تول میں گڑبڑ اور اجناس میں ملاوٹ کی خرابی عام ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر صریحاً ظلم کرتے ہیں، ہر قوت والا اپنے سے کمزوروں کا استحصال کرتا ہے، آمدنی بڑھانے کے لیے حرام ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، رشوت کا دَور دَورہ ہے، قومی اموال و املاک اور مناصب کی امانتوں میں خیانت کا روگ عام ہے، اور آلودگیٔ قلب و نظر اور ناپاکیٔ خیال کی

کی وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ ہمارے تفرقہ پسند علماء یہ بحثیں تو چھیڑتے ہیں کہ فلاں صحیح مسلمان اور فلاں غلط، فلاں محبّ رسولؐ اور فلاں قدر ناشناسِ رسولؐ (بلکہ حضورؐ کو بشر ماننے والوں کو توہینِ رسالت کا مجرم اور اس بنا پر کافر تک قرار دیا جاتا ہے) - اور فلاں کے پیچھے نماز ناجائز اور فلاں کے ساتھ قرابت و موانست حرام اور فلاں کے ساتھ کسی امرِ حق میں بھی تعاون کرنا جُرم، مگر یہ حضرات اس پر زور نہیں دیتے کہ سچا خدا پرست اور محبّ رسولؐ وہ ہے جو اقامتِ دین کے نصب العین کے لیے اپنی تمام قوتیں وقف کر دے۔ دُنیا کے سامنے حق کا گواہ بن کے کھڑا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے، اپنا پورا زور اُن مخالفِ دین عالمی نظریات و تحریکات کا طلسم توڑنے پر صَرف کر دے جو مسلمانوں کو ایمان سے محروم کر کے الحاد اور مادہ پرستی اور فحاشی کی راہ پر لے جانا چاہتی ہے۔ وہ معاشرے کو تباہ کُن احوال سے نکالنے کے لیے ایک ایک فرد کو تلقین کرے کہ وہ دل و نگاہ، دہن کو اور شکم کو حرام سے پاک رکھے۔ نیز تمام مسلمانوں میں وحدت و اخوت پیدا کرنے کے لیے سرگرم کار ہو۔

اِس وقت جو ہلاکت انگیز خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اُن میں مسلم معاشرے کی اکثریت مبتلا ہے۔ اس اکثریت میں ہر فرقے اور گروہ کے لوگ شامل ہیں، غالباً کوئی مذہبی فرقہ اور دھڑا ایسا نہیں کہ جس میں کسی نہ کسی بگاڑ میں مبتلا لوگ موجود نہ ہوں، مگر اُن کے لیے یہی بات بڑا سرمایۂ اطمینان ہے کہ ہم فلاں بخشے بخشائے گروہ میں شامل ہیں یا فلاں حضرت کے کفش بردار ہیں، یا فلاں عالِم کے مقرب ہیں۔ اور اُن کے پیشوا اس پر خوش کہ یہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں، آخر ہمارے ہیں۔ کلامی اور فقہی جھگڑوں میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں، ہماری پیروی کرنے والے انسانی ریوڑ کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہیں، ان کے دماغ اور ان کے اموال ہماری قوت بڑھاتے ہیں۔ اور یہ ہمارے بنائے ہوئے گروہی عصبیت کے باڑے سے باہر قدم نہیں رکھتے اور نہ باہر کے کسی فرد کے لیے محبت و احترام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ خواہ باہر کا آدمی نگاہِ حرام، کلامِ حرام اور رزقِ حرام سے اپنے آپ کو بچانے میں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دیتا ہو اور اتحادِ اُمت کے لیے کتنی ہی تگ و دَو کرتا ہو۔ اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے کیسا ہی جذبۂ بیتاب کیوں نہ رکھتا ہو۔

آج تو وہ وقت آگیا ہے کہ تمام گروہوں کے علما اپنے منبروں سے، صوفیا اپنے سجادوں سے، سیاسی اکابر اپنے اسٹیجوں سے اور صحافی اور ادیب اپنی دُنیائے قلم و قرطاس سے اُمّت محمدیہ کے ایک ایک فرد کو اس بات کی تعلیم دیں کہ وہ رشوت سے بچے، کسی پر ظلم نہ کرے، ناجائز طریقوں سے آمدنی نہ بڑھائے، سود کا لین دین نہ کرے۔ مال حرام سے بچے، جُرم و تشدد سے پرہیز کرے، توحید کا علمبردار بنے۔ رسولؐ کی پیروی کرے، مسلمانوں کے ساتھ اتحاد اور اخوت کا تعلق رکھے، اور ہر اس کوشش میں تعاون کرے جو غلبۂ دین کے لیے کی جا رہی ہو اور غلبۂ دین کی مہم اس اخلاقی بگاڑ کے ہوتے ہوئے مشکل ہی سے آگے بڑھ سکتی ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔

یہ کام اگر نورانی میاں کے ہاتھوں ہو تو برحق، اسے اگر جامعہ اشرفیہ لاہور اور جامع العلوم کراچی کے اکابر سرانجام دے سکیں تو مبارک، اہلِ حدیث برادران اس کے لیے اگر کچھ خدمت سرانجام دیں تو آنکھیں فرشِ راہ، اِس کے لیے اگر تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں فضا تیار کرنے میں ممد ہوں تو وہ قابلِ قدر۔ اسی طرح امت کے دوسرے فرقے اتحادِ مسلمین اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں کچھ کام کر دکھائیں تو وہ مقبول و مطلوب اور یہی اگر مارشل لاء اور قومی اتحاد کی موجودہ حکومت کے ہاتھوں ہو جائے تو مقامِ مسرت! اِس میں حریفانہ و رقیبانہ احساسات کا کیا جواز!

اُمّتِ محمدیہ کے اندر عام حالات میں بھی، فرقہ وارانہ ذہنیت کو برسرِ عمل نہیں آنا چاہیے، کجا کہ موجودہ نازک ترین حالات میں، جبکہ خطرے باہر سے بھی جھانک رہے ہیں، مزاحمتیں اندر سے بھی ہو رہی ہیں، اور جو لوگ دین کی کچھ خدمت کرنے کے لیے میدان میں اُترتے ہیں، اُن پر پہلا قدم رکھتے ہی سنگ باری خود سرپرستانِ دین اور اجارہ دارانِ نظامِ مصطفیٰؐ ہی کی طرف سے ہو رہی ہے۔

کیا سنّت والا اسلام یہی ہے!

کچھ سوچیے، اور دین پر اور طریقِ سنّت پر اور اُمّتِ محمدیہ پر رحم کیجیے!

حضور نبی اکرمؐ نے اختلاف کو رحمت قرار دیا ہے، مگر جب کبھی اختلاف باعثِ زحمت

اور وجہ نزاع و تصادم بن جائے تو وہ صحت مند اختلاف نہیں ہے جو خیر و فلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس سلسلے میں چند باتیں بڑی اصولی ہیں۔

۱۔ اختلاف خدا اور رسولؐ کی رضا کے لیے کیا جائے، نفسانیت، بگڑی ہوئی نفسیات، ذاتی مفاد یا رنجش و حسد یا گروہی عصبیت کو اس میں دخل نہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اختلافی امور میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں سے بڑے بڑے نتائج برآمد نہ کیے جائیں۔

۳۔ زبان شائستہ استعمال کی جائے اور جذبات کا دخل اظہار اختلاف میں اتنا زیادہ نہ ہو کہ اشتعال انگیزی کا رنگ پیدا ہو جائے۔

۴۔ مخاطب یا زیرِ تذکرہ فرد یا جماعت یا مسلک کو تحقیر اور تضحیک کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

۵۔ اساسی ایمانیات میں اگر واضح خلل نہ پایا جائے تو کسی سے نہ ترکِ اسلام و کلام جائز ہے نہ نمازوں اور مسجدوں کی علیحدگی اور نہ دُنیا کے کاروبار یا ازدواجی تعلقات میں انقطاع۔ ایک آنکھ اگر چھوٹے چھوٹے اختلافات پر لگی ہے، تو دوسری سے اُس بڑے کلمۂ سوا پر بھی نگاہ رکھیے جو سرمایۂ اتحاد ہے۔

ان باتوں کا جب خیال نہیں رکھا جاتا تو اختلافات پہلے تفرقہ کا، پھر تصادم کا اور پھر تباہی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی اپنا ایک کلیہ اس بارے میں بیان کیا تھا، اور اب پھر اُسے دوہراتا ہوں۔ وہ ہے "اختلافات کے باوجود اتحاد" کسی نبی کی اُمت تو کیا، کسی ریاست، کسی معاشرے، کسی جماعت، کسی خاندان، اور کسی فرم کے لوگ بھی اس کلیے کے بغیر متحد نہیں رہ سکتے۔

اختلافات تو ہر انسانی اجتماع میں ناگزیر ہیں۔ مگر اُن کو وجہ تخریب بننے سے روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ اصولوں اور بنیادوں میں اتحاد کو مستحکم رکھتے ہوئے اختلافات کو ایسے مناسب حدود میں رکھا جائے کہ بنیادی اتحاد کو ضرر نہ پہنچا سکیں۔

نہ یہ ممکن ہے کہ اختلافات بالکل ختم ہو جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ جہاں کوئی اختلاف ہوا آپ نے بنیادی اتحاد کے بندھن توڑے، بستر یا بستر اُٹھایا، اصیل مُرغ (بقیہ اشارات ۴۸)

تعزیراتِ اسلام

جناب قاضی بشیر احمد صاحب - باغ - آزاد کشمیر

(۱۲)

تشریح ۱۴۔

حقِ دفاع۔

قاتل کو قصاص میں قتل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ قاتل نے قتل حقِ دفاع کے طور پر نہ کیا ہو۔

حقِ دفاع کی تشریح مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ تعریف۔

اگر کوئی مکلف شخص دوسرے آدمی پر بطور ظلم حملہ آور ہو اور دوسرے شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ حملہ آور سے اس کی جان، یا اعضا، مال اور عزت کو نقصان پہنچے گا جس کے بچاؤ کی کوئی ایسی صورت بجز حملہ آور کے قتل کے ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں حملہ آور کو قتل کرنا جائز ہو گا۔ اور یہ قتل حقِ دفاع کے طور پر کہلائے گا۔[۱]

۲۔ حقِ دفاع کے طور پر حملہ آور کو قتل کرنا موجب سزا نہ ہو گا۔[۲] اس لیے کہ اس جرم سے

---

[۱] الدر المختار جلد ۵ ص ۳۶۲ والبحر جلد ۸ ص ۳۴۴

[۲] ایضاً

حملہ آور نے اپنی عصمتِ نفس کو زائل کر دیا۔

۳۔ جن صورتوں میں انسان کو خود حقِ دفاع حاصل ہوتا ہے، انہی صورتوں میں اس کو دوسرے شخص کے لیے بھی حملہ آور کے دفاع کا حق حاصل ہوگا۔ اس صورت میں بھی حملہ آور کا قتل موجب سزا نہ ہوگا[۱]

چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا"[۲] یعنی تم اپنے بھائی کی امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم کی امداد اُس کو ظلم سے روک کر عذاب سے بچانا ہے اور مظلوم کی امداد اس کی دادرسی کرتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے "اِنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یَتَعَاوَنُوْنَ عَلَى الْفَتَّانِ"[۳] یعنی مومنین مصائب میں ایک دوسرے کی ضرور امداد کرتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے حملہ آور کے دفاع میں مظلوم کے ساتھ تعاون کرنے کا ثبوت واضح ہے۔

۴۔ مندرجہ ذیل احادیث حقِ دفاع کے ثبوت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

ا۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے کسی مسلمان پر تلوار سے حملہ کیا اس کا خون رائیگاں ہے[۴]"۔

ب۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "جو شخص لوہے کے ساتھ کسی مسلمان کی طرف اشارہ کرکے اس کے قتل کا ارادہ ظاہر کرے تو اس کو قتل کرنا واجب ہے[۵]"۔

---

[۱] الدر المختار جلد ۵ ص ۳۶۲ مطبوعہ بولاق مصر۔

[۲] بحوالہ المغنی لابن قدامۃ جلد ۱۰ ص ۳۵۳۔ [۳] ایضاً

[۴] الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ جلد ۲ ص ۵۶۰۔

[۵] زیلعی جلد ۲ ص ۳۴۴۔ بحوالہ اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۰۶۔

ج۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کہ اگر کوئی شخص آکر میرے مال کو لینا چاہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ "تو اس کو اپنا مال نہ دے۔" اس پر اس نے پوچھا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو؟ اس پر آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ "تو اس کو قتل کر دے۔" اس پر اس شخص نے پھر دریافت کیا کہ اگر وہ مجھے قتل کر دے تو پھر؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو شہید ہے۔ اس پر سائل نے پھر پوچھا کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں تو؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں ہوگا۔[۱]

د۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص اپنے مال کی خاطر مارا جائے، وہ شہید ہے۔"[۲] ایک دوسری حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ جو شخص اپنے مال کے لیے قتل ہوا وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے دین کے لیے قتل ہوا وہ شہید ہے۔ اور جو شخص اپنی اہل کے لیے قتل ہوا وہ شہید ہے۔ بخاری اور نسائی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جو ظلم کے دفاع میں قتل ہوا وہ بھی شہید ہے۔[۳]

ھ۔ ایک اور حدیث جو سماکؒ بن حرب کی سند سے مروی ہے، میں ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آکر میرا مال لینا چاہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تو اس کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلا۔ اس پر اس نے پھر پوچھا کہ اگر میں اس کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلا دوں مگر وہ کوئی پروا نہ کرے تو؟ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تو سلطان سے مدد مانگ۔ سائل نے پھر کہا کہ اگر وہ انکار ہو جائے تو؟ آپؐ نے فرمایا کہ "جو تیرے پاس موجود ہو اس سے مدد طلب کر۔" سائل نے پھر دریافت کیا کہ اگر میرے پاس کوئی موجود ہی نہ ہو تو؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو اس وقت تک اپنے مال کے لیے اس شخص سے لڑائی کر حتیٰ کہ تو مال کو حاصل

---

[۱] الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ ج ص [۲] ایضاً

[۳] بحوالہ اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۰۸

کر لے یا وہ تجھے قتل کر دے۔ اگر اس نے تجھ کو قتل کر دیا تو تُو آخرت کے شہداء میں سے ہو گا۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حتی الوسع کوشش کرنی ضروری ہے کہ حملہ آور کو قتل کرنے کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ سے، اُس کو جرم کے ارتکاب سے روکا جائے۔ اگر اور کوئی طریقہ ممکن نہ ہو تو اس سے لڑائی ناگزیر ہے۔

۵۔ حملہ آور کے دفاع کے مندرجہ ذیل شرائط ہیں جو مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ دوسرے شخص کا حملہ کسی حقِ واجب کی ادائیگی کے طور پر نہ ہو بلکہ ظلم کے طور پر ہو۔

لہٰذا باپ اپنے بیٹے کو یا خاوند اپنی بیوی کو یا استاد اپنے شاگرد کو، ادب سکھانے کے لیے سزا دے یا جلاد قصاص کے طور پر کسی کا ہاتھ یا گردن وغیرہ کاٹے، تو اس طرح کی جملہ صورتیں ظلم و زیادتی کے تحت شمار نہ ہوں گی۔ چنانچہ اس طرح کی صورتوں میں حقِ دفاع حاصل نہ ہو گا۔

۲۔ یہ کہ ظلم کی حالت فی الحال موجود ہو۔ مثلاً حملہ آور تلوار وغیرہ لے کر قتل کرنے کے لیے بالکل تیار ہو، جس کو دیکھ کر یہ باور ہوتا ہو کہ، یہ ابھی قتل یا قطع وغیرہ کرنے والا ہے، تو ایسی صورت میں حملہ آور کا دفاع ضروری ہو جائے گا:

۳۔ یہ کہ حملہ آور کا قتل، حقِ دفاع کی حیثیت سے اس وقت محسوب ہو گا جب کہ اُس کا دفاع کسی دوسرے طریقہ سے ممکن نہ رہا ہو۔

۴۔ یہ کہ حملہ آور ظلم و زیادتی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۵۔ یہ کہ دفاعی عمل بقدر ضرورت ہو گا۔

مثلاً دفاع عموماً (۱) چیخ و پکار (۲) غیر مہلک ہتھیار (۳) اور مہلک ہتھیار سے کیا جاتا ہے تو اب اگر ۱ سے دفاع ممکن ہو تو ۲، ۳ کے ذریعے دفاع ممنوع ہو گا۔ اگر ۱ سے حملہ آور

---

[۱] الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ جلد ۲ ص ۵۶۸۔

باز نہ آئے تو ۲ سے دفاع کیا جائے گا اور ۳ سے ممنوع ہوگا۔ اگر اس سے بھی باز نہ آئے تو ۳ کیا جائے گا، حتیٰ کہ حملہ آور سے مظلوم، اپنے حقوق کو محفوظ کرلے۔ اس دوران اگر حملہ آور قتل ہو جائے تو اس کا خون رائیگاں ہوگا۔

۶۔ حملہ آور کا تعاقب۔

اگر حملہ آور مستغیث کا مال لے کر بھاگ جائے تو اُس کو چھوڑانے کے لیے مستغیث کو اس کا پیچھا کرنے کا حق ہے۔ اس دوران مستغیث اگر بامرِ مجبوری حملہ آور کو قتل کردے تو اس کا خون رائیگاں ہوگا۔[1]

۷۔ ارتکابِ جرم سے قبل دفاع۔

دفاع کے لیے حملہ آور کا ارتکابِ جرم ضروری نہیں ہے، البتہ اس کے ارادۂ جرم کا یقین ہو جانا ضروری ہے۔ مثلاً حملہ آور چیخ وپکار کے باوجود نہ بھاگے یا کوئی ڈاکو شور سُننے کے باوجود نقب لگانا ترک نہ کرے، تو باور کیا جائے گا کہ حملہ آور اپنے اِرادہ جرم کو عملی تشکیل دینے پر تُلا ہوا ہے، تو ایسی صورت میں اس کا دفاع ارتکابِ جرم سے قبل بھی کیا جا سکتا ہے۔[2]

۸۔ دفاع کے لیے مال بمقدار نصاب سرقہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

مال خواہ قلیل ہو یا کثیر، اس کے بچاؤ کے لیے دفاع کیا جائے گا[3] اس لیے کہ حدیث "قَاتِلْ دُوْنَ مَالِكَ" عام ہے۔

۹۔ غیر مکلّف حملہ آور کا دفاع۔

اگر حملہ کرنے والا نابالغ یا مجنون ہو، یا کوئی جانور ہو تو اس کے دفاع میں مذکورہ بالا حقِ دفاع حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا اُن کو دفاع میں قتل کرنے کی صورت میں، نابالغ اور مجنون کی دِیت، قاتل پر لازم ہوگی جو اپنے مال سے ادا کرے گا اور جانور کی قیمت بطور تاوان اس کے مالک کو ادا کرے گا۔[4]

[1] الدرالمختار جلد ۵ ص ۳۶۲۔ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] ہدایہ جلد ۴ ص ۵۶۸۔ البحر جلد ۸ ص ۳۴۴۔

درحقیقت اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی۔ امام یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جانور کی ضمان قاتل پر ادا کرنا لازم ہوگی اور نابالغ اور مجنون کو قتل کی وجہ سے قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی۔

امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ قاتل نے اپنے نفس سے اُن کے شر کو دُور کرنے کے لیے قتل کیا ہے لہٰذا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دفاع میں کوئی بالغ اور عاقل حملہ آور قتل ہو جائے۔

امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ جانور کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ بخلاف مجنون اور نابالغ کے افعال کے کہ ان کا اعتبار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر یہ کوئی نقصان کر دیں تو ان پر ضمان واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا نابالغ اور مجنون کی عصمت خود اُن کے وجود کے لیے ہے۔ اگر وہ عصمت کو زائل کر دیں تو ان کا دَمْ (خون) مباح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ دفاع میں مارے جائیں تو کوئی چیز قاتل پر عائد نہ ہوگی۔ اور بخلاف جانور کے، کہ اُس کی قیمت اُس کے مالک کو ادا کرنی ضروری ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کی عصمت حقِ نفس کے لیے نہ تھی بلکہ حقِ مالک کے لیے تھی۔[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس طرح کہ جانور کا فعل عصمتِ نفس کو زائل نہیں کرتا۔ اسی طرح مجنون یا نابالغ کا فعل بھی عصمت نفس کو زائل نہیں کرتا۔ لہٰذا قاتل نے جب اس کو قتل کیا تو اُس نے معصوم الدم (جس کا خون بہانا ممنوع ہو) شخص کو قتل کیا۔ جس کی وجہ سے قاتل سے قصاص لینا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ قاتل نے ان کو دفاع میں قتل کیا ہے جو موجب شبہ ہے لہٰذا قصاص شبہ کی وجہ سے ساقط ہوگا۔ البتہ قاتل پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے مال سے دیت ادا کرے۔

اور مجنون وغیرہ کے فعل کو، عاقل اور بالغ پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ عاقل، بالغ کا فعل اختیاری ہوتا ہے اور مجنون وغیرہ کا فعل اختیاری نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] ہدایۃ جلد ۴ ص ۵۶۸

[2] ایضاً

فصل سوئم

آلۂ قتل کے ذریعے قتل کی نیّت کا علم

دفعہ ۴ (ا) نیت قتل کا علم ملزم کے اقرار یا آلہ قتل سے ہو گا۔[۱]

(ب) آلہ قتل موجب قصاص۔

اگر آلۂ قتل ایسا ہتھیار ہو جس کو عموماً قتل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جو جسم کو زخمی کرنے اور کاٹنے میں آہنی آلہ کی مانند ہو تو اس طرح کے آلۂ قتل سے جرم قتل کا ارتکاب، عمداً قتل باور کیا جائے گا۔[۲]

(ج) قتل اس صورت میں بھی عمداً متصور ہو گا جب کہ قاتل نے معمولی آہنی چیز، جیسے سوئی یا قلم کا نب وغیرہ سے، جسم کے مَقتَل میں، یا غیر مَقتَل میں مبالغہ کے ساتھ، زخم پہنچا کر قتل کا ارتکاب کیا ہو۔[۳]

تشریح ۱۔ مَقتَل سے مراد بدن انسانی کے وہ نازک ترین مقامات ہیں جہاں پر زخم لگانے سے عموماً موت واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً دل، کان پٹی وغیرہ۔ ان مقامات پر زخم پہنچا کر قتل کرنا، دلیل عمداً قتل کی ہو گی۔ اسی طرح اگر مَقتَل کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں میں اسی طرح کا آہنی آلہ مسلسل استعمال کر کے قتل کیا جائے تو بھی عمداً قتل ہو گا۔[۴]

تشریح ۲۔ قاتل کی نیت قتل کا علم چونکہ کسی دوسرے انسان کو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آلۂ قتل

---

[۱] البحر جلد ۸ ص ۳۲۸۔ مطبوعہ دار المعرفۃ۔ لبنان۔

[۲] الدر المختار جلد ۵ ص ۳۵۰۔ مطبوعہ بولاق۔ مصر۔

[۳] ایضاً والمغنی جلد ۹ ص ۳۲۱، ۳۲۲۔ مکتبہ سلفیہ۔ مدینہ منورہ۔

[۴] رد المحتار جلد ۵ ص ۳۵۰۔

کو نیت کا ترجمان قرار دیا جائے گا۔

البتہ آلۂ قتل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر آلۂ قتل کے اندر جارحہ کی صفت موجود ہو تو قتل عمداً منصور ہو گا۔ ورنہ نہیں[۱]۔ یعنی اُن کے نزدیک آلۂ قتل ایسا آلہ ہو جو جسم کو چیر پھاڑ کر ٹکڑے کر سکے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آلۂ قتل کا جارحہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک لوہے کی ہر چیز سے قتل، عمداً قتل منصور ہو گا خواہ وہ جسم کو چیر پھاڑ سکے یا کچل سکے۔ وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ "اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ" اس آیت میں لوہے کے اندر "بأس شدید" کی صفت کا اظہار ہے اور اس سے مراد قتل ہے لہٰذا لوہے کی ہر چیز کے ساتھ قتل کرنا موجب قصاص ہو گا[۲]۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی صاحبین سے اتفاق رکھتے ہیں۔ نیز ان حضرات کے نزدیک جس چیز سے قتل ہونے کا غالب گمان پایا جائے اس کے ذریعے قتل کرنا بھی قتلِ عمد ہو گا، جیسا کہ بڑی لاٹھی اور بڑے پتھر سے قتل۔ بخلاف امام ابو حنیفہؒ کے کہ اُن کے نزدیک یہ قتل شبہِ عمد میں داخل ہو گا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَلَا اِنَّ دية الخطاء شبه العمد ما كان بالسوط والعصا مائة مِن الابل منها اربعون فی بطونها[۳]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوڑے اور لاٹھی کے ذریعے قتل، قتلِ عمد نہ ہو گا بلکہ اس

---

[۱] وروى الطحاوی عن الامام اعتبار الجرح فی الحدید ونحوه قال الصدر الشهید وهو الاصح ورجحه فی الهداية وغيرها - رد المحتار جلد ۵ ص ۳۵۰ -

[۲] حاشیہ ہدایہ جلد ۴ ص ۵۶۵ ورد المحتار جلد ۵ ص ۳۵۰ -

[۳] ابو داؤد ص ۶۶۵ - مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند -

کا شمار شبۂ عمد میں ہوگا۔ جس کی سزا دیت ہے۔ اگر یہ قتل عمداً ہوتا تو اس کی سزا قصاص ہوتی۔

۲۔ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ "اِنَّ العمد السلاح وشبہ العمد الحجر والعصا"[۱] یعنی قتل عمد ہتھیار کے ذریعے ہوگا اور لاٹھی اور پتھر سے قتل، شبہ عمد ہوگا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ قتلِ عمد "سلاح" کے ذریعے ہوگا یعنی ایسے آلہ کے ذریعے ہوگا جس کے اندر صفتِ جارحہ موجود ہو۔ اگر غیر آہنی آلہ بھی سلاح کا کام کرے تو اس کا حکم بھی آہنی جارحہ آلہ کا ہوگا۔ لہٰذا چاقو، چھری، نیزہ، بندوق، دھاری دار پتھر، دھاری دار لکڑی، بغیر پھل والا نیزہ، آگ، گرم پانی وغیرہ آلات کے ذریعے قتل، قتلِ عمد ہوگا۔[۲]

نیز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے موقف کی تائید مندرجہ ذیل روایات سے بھی ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتوں کے درمیان لڑائی ہوگئی جس پر ایک نے دوسری پر پتھر مارا جس سے وہ قتل ہوگئی اور جو کچھ اس کے پیٹ میں تھا وہ بھی مرگیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جنین کا تاوان، ایک غلام یا باندی کا تاوان ہے۔ اور عورت کے بدلہ میں اس کی عاقلہ پر دیت ہے۔[۳]

۲۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے اپنی سوکن کو خیمہ کی لکڑی ماری جس سے وہ قتل ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولہ کی دیت کو قاتلہ کی عاقلہ پر فرض کیا۔[۴]

مذکورہ ہر دو روایات سے معلوم ہوا کہ پتھر اور لکڑی کے ذریعے قتل کا شمار، قتلِ عمد میں نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان آلات سے قتل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی سزا دی ہے۔

---

[۱] بحوالہ اعلاء السنن جز ۱۸ ص ۱۰ ۔ مصنفہ مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

[۲] درمختار جلد ۵ ص ۳۵۰

[۳] متفق علیہ کذا فی المنتقیٰ بحوالہ اعلاء السنن - جز ۱۸ ص ۴۵ -

[۴] ملخصاً رواہ المسلم ج ۲ ص ۶۲ مطبوعہ اصح المطابع آرام باغ - کراچی -

اگر قتل عمداً شمار ہوتا تو مجرم کو قصاص کی سزا دی جاتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لکڑی اور پتھر خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، کیونکہ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے، ان سے قتل کرنا موجب قصاص نہ ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ رح کا مسلک ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھاری لکڑی یا بڑے پتھر وغیرہ ثقیل چیز کے ساتھ قتل کرنا، موجبِ قصاص ہوگا۔ اور احناف میں سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کا موقف بھی یہی ہے[1]۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک باندی کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا۔ ابھی اس عورت کی کچھ زندگی باقی تھی تو اُس سے مجرم کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کون ہے؟ مگر وہ بول نہ سکی۔ پھر مشتبہ یہودی کا نام اس کے سامنے ذکر کیا گیا تو اُس نے سر کے اشارہ سے بتایا کہ مجرم یہی شخص ہے۔ اس پر یہودی کو پکڑا گیا اور اُس نے اعتراف کرلیا کہ واقعی یہ جرم میں نے کیا ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ یہ جرم اُس نے زیور حاصل کرنے کے لیے کیا تھا جو اُس نے پہنا ہوا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا[2]۔

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ یوں استدلال کرتے ہیں کہ اس واقعہ میں یہودی کا سر پتھروں سے کچلا گیا تھا جس طرح کہ اُس نے باندی کا سر کچلا تھا تو معلوم ہوا کہ بڑے پتھر یا لکڑی وغیرہ سے قتل بھی، قتلِ عمد ہوگا۔ جس کی سزا قصاص ہوگی۔

مگر یہ استدلال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے موقف کو کمزور نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سزا بطور قصاص نہ دی ہو بلکہ بطور سیاست

---

[1] ہدایہ جلد ۴ ص ۵۶۰۔ مطبوعہ کلام کمپنی۔ کراچی۔

[2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۵۸۔ اصح المطابع۔ آرام باغ۔ کراچی۔

تعزیری سزا دی ہو۔ اس لیے کہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ یہودی نے باندی کا قتل، زیور حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس طرح کے جرم کا ارتکاب کرنا قطاع الطریق کی شان ہوتی ہے اور ان کو حاکم مجاز تعزیری سزا بھی دے سکتا ہے[1]۔

بھاری چیز سے قتل کے مسئلے میں امام ابو حنیفہ رح کا صحیح مذہب

علاوہ ازیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھاری چیز سے قتل اس صورت میں عمداً متصور نہ ہوگا جب کہ اس کا مقصد صرف قتل کرنا نہ ہو۔ اور اگر قاتل کا مقصد صرف قتل کرنا ہی ہو تو ایسی صورت میں بھاری چیز سے قتل، عمداً قتل متصور ہوگا[2]۔

اگر ثقیل چیز سے قصداً قتل کیا جائے تو امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ سب کا اتفاق ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں قصاص واجب ہوگا۔

(باقی)

---

[1] البحر جلد ۸ ص ۳۳۹

[2] مذهبه ان القتل بالمثل غير موجب للقود اذا لم يكن القتل مقصوداً كما نصه عليه في المجتبى بحواله اعلاء السنن ج ۱۸ - ص ۷۵ -

رب العالمین

حصہ دوم ——— مقصود زیست

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۳)

رب العالمین کی ربوبیت کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک ربوبیت اس جسم کو پالتی ہے جو آج ہے اور کل فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔ اور ایک ربوبیت روح کی غذا کا اہتمام کرتی ہے جو ازل سے ابد تک خدا کے حکم کی مانند جاری وساری ہے اور ایک زندہ و پائندہ ہستی کی حیثیت میں فانی جسم سے زیادہ قیمتی ہے۔ کیا جسم کو پالنے والا روح کی پرورش کا انتظام نہ فرمائے گا؟ اس سمیع و بصیر ہستی سے یہ امر عقلاً بعید ہے کہ وہ جسم کی تو پرورش و پرداخت کا اتنا اہتمام کرے اور روح کو نظر انداز کر دے جو اس کے حکم کا حصہ ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ انسان اس کی بندگی بجا لائیں۔ اس لیے کہ اس نے انسان کو بندے بنا کر ہی پیدا کیا ہے اور پھر ان کی پرورش کا انتظام و التزام کیا ہے۔ شعور و احساس اور ارادہ دے کر باقی مخلوقات کے مقابلے میں انہیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ گویا سامانِ زیست فراہم کرنے والے کے ہی ذمے ہے کہ وہ مقصودِ زیست بھی بتائے ورنہ انسان تو ظلوم و جہول ہے اور بے خبر اور بے علم ہے۔ اگرچہ اس کا وجدان ہمیشہ کسی بالاتر قوت کی بندگی کا مطالبہ کرتا رہتا ہے جو شاید اس کے میثاقِ ازل کا پرتو ہے۔ لیکن واضح تعلیم و ہدایت سے وہ محروم ہے

اس لیے رزقِ جسمانی و مادی کے ساتھ ساتھ رزقِ روحانی فراہم ہونا بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کا انتظام بھی مالک کے ہی ذمے ہے۔

وہ پرورش کرنے والا جو جسم کی ظاہری نشو ونما کے ساتھ ساتھ اس کی باطنی صلاحیتوں خوبیوں اور خصوصیات میں بھی نوع بہ نوع اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور اسے ارادہ، شعور، احساس، جذبہ اور نہ معلوم کن کن خفیہ صلاحیتوں سے نوازتا ہے۔ اس سے یہ بات بعید ہے کہ وہ انسان کی رُوح کی رہنمائی کا اہتمام نہ کرے۔ یہ اُس کی ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ وہ اس کے کلمے سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔" حضرت مسیحؑ کا یہ ارشاد اس حقیقت کی طرف مکمل اشارہ کرتا ہے جس حقیقت کو ہم حقیقتِ منتظر کہہ سکتے ہیں۔ اس حقیقت منتظر سے آگاہی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔

وہ حقیقتِ منتظر کیا ہے، یہ کہ اس کائنات کا ایک رب ہے جو خالق و مالک و آقا ہے اور ساری مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے اس لیے اسی کا یہ حق ہے کہ تمام مخلوق اس کی بندگی بجا لائے۔ لیکن بندگی بجا لانے کے طریقے کس سے معلوم کرے اس کا انتظام بھی جسمانی غذا فراہم کرنے والے مالک نے روحانی غذا کی خاطر انبیاء کرام کے سلسلہ کی صورت میں کیا ہے جو انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں اور انسانوں کو خدا کی مرضیات سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ انہیں اپنے جسم و جان کی غایت اور اپنی پرورش کے اسباب کا علم ہو جائے۔ انبیائے کرام انہیں بتاتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں بے مہار نہیں ہے بلکہ مسئول ہے اور ایک دن یومِ حساب ہوگا۔ جب اُس سے اُس کی دُنیوی زندگی کے سارے کارنامے کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔

یہ انبیاء کا سلسلہ بھی پوری انسانی تاریخ میں مالک کی روحانی ربوبیت کا ایک دوسرا شاہکار ہے۔ یہ انبیاء اپنے خاص ذرائع سے انسانوں کو جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی اور خالق کی رضا سے بھی آگاہ کرتے ہیں اس سلسلے کو سلسلۂ رسالت کہا جاتا ہے۔

رسالت خدا اور بندے کے درمیان ایک معتبر ترین واسطہ ہے، بندہ خدا کی ذات سے تحت الشعور میں تو باخبر ہے لیکن اپنے حواس خمسہ سے اس کا ادراک نہیں کر سکتا جس طرح وہ دوسری مادی چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔ وہ عقلی دلائل، آیاتِ الٰہی، مناظر فطرت، قوت و ہیبت

کے مظاہر اور مالک کے احسانات کے مختلف گوشوں کا احساس کر کے اس امر سے تو ضرور آگاہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی بالاتر ذات موجود ہے جو اس کی ہستی اور اس کے عالم سے ورا الورا ہے جو اس کی ہستی سے بے حد قریب ہے۔ اور اس کی عقل کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ لیکن اس کا حقیقی شعور اس کے احکام اور اس کی مرضی سے آگاہی اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فہم و ادراک سے عقلی طور پر خدا کی ہستی کا قائل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ہو جو اس کا تعارف اُس کے مالک سے کرائے۔

ہر قوم کو انسانوں کے مالک سے تعارف کرانے والی ہستیاں ہی رسول کہلاتی ہیں۔

یہ رسول دُنیا کی قوموں کی طرف سے دعوت اور رہنمائی کے لیے مقرر کردہ نہیں ہوتے۔ یہ رسول خود اپنے طور پر بھی اس کام کے لیے اُٹھ کھڑے نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ رسول خدا کے منتخب کردہ افراد ہوتے ہیں جو ہر قوم تک اپنے اپنے دَور میں ان کے حقیقی مالک کا پیغام پہنچاتے ہیں، ہر زمانہ میں یہ رسول اُٹھتے رہے اور ہر قوم میں اپنے خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ لیکن چونکہ خدا ایک ہی ہے۔ اس لیے ہر قوم کی طرف ہر زمانے میں ہر رسول کی معرفت ایک ہی پیغام ارسال کیا جاتا رہا اور ان میں زمانوں، علاقوں، نسلوں، اور زبانوں کے فرق کے باوجود پیغام میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا۔ اور چونکہ خدا اور بندے کا حقیقی رشتہ بندگی کا رشتہ ہی ہے اس لیے ہر دَور میں ہر نبی کے ذریعے خدا کا پیغام بھی اسی امر پر مشتمل رہا کہ "خدا کے بندو خدا کی بندگی اختیار کرو اس لیے کہ اس کے سوا تمہارا اور کوئی خدا نہیں ہے"۔ یہ پیغام متواتر تکرار اور تسلسل کے ساتھ ہر قوم کی طرف آتا رہا ہے اگر ہم زمان و مکان کے فاصلوں کو کاٹ کر تمام قوموں کے انبیاء کی حقیقی دعوت کو یکجا کریں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ تمام انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی بات کہی۔ کسی نے اپنی بندگی کروانے کی کوشش نہیں کی۔ اور کسی نے اس دعوت سے اپنا مفاد بھی حاصل نہیں کیا البتہ اس سادہ دعوت کے نتیجے میں انھوں نے سخت ترین مخالفتوں کو برداشت کیا اور زندگی کی آخری گھڑیوں تک اپنی قوم کے افراد کو یہی دعوت دیتے رہے اور انھیں بتاتے رہے کہ ان کے دُنیوی اور اُخروی مفادات بس اس بات کو تسلیم کرنے میں ہی پوشیدہ

ہیں کہ وہ اپنے حقیقی منعم کو شناخت کریں۔ اس کی ذات کا اعتراف کریں اور اس کی مرضیات اور احکام کی پابندی کریں جو احکام خود اُن کے اندر عدل و انصاف اور امن و امان قائم کرنے کے لیے ہی دیے گئے تھے۔

رسالت کے ذریعے ہی بنی نوع انسان کو یہ معلوم ہوا کہ انسانوں اور جنوں کی پیدائش کی تو غرض و غایت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کی بندگی، اطاعت اور عبادت کریں اور دُنیا کے باقی سارے کام اسی حقیقی غرض و غایت کے تحت سر انجام دیں۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریات: ۵۶)

ظاہر ہے کہ جس مقصد کے لیے کوئی چیز بنائی گئی ہو اگر اس کام کے لیے وہ استعمال نہ کی جائے تو اس کا مقصدِ تخلیق ہی فوت ہو جاتا ہے اور اس کی ہستی کا مصرف ہی رائیگاں ہو جاتا ہے۔ اگر گھڑی کو وقت دیکھنے کی بجائے پانی ڈالنے کے لیے استعمال کیا جانے لگے۔ اور ٹوپی کو سر پہ اوڑھنے کے بجائے اسے کاسہ گدائی بنا لیا جائے تو ظاہر ہے . . . . کہ ان چیزوں کا مقصدِ وجود ہی فوت ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کاموں کے لیے دوسری چیزیں موجود ہیں۔ اسی طرح انسان اگر اپنے مقصدِ زیست یعنی اپنے مالک کی عبادت کی بجائے صرف کھانے پینے رہنے سہنے اور نسل کشی کے کام کو ہی اپنا مقصدِ زیست قرار دے لے تو اس کے وجود کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اور وہ اشرف المخلوقات کے مقام سے گر کر دیگر حیوانات کی سطح پہ آ پڑتا ہے بلکہ اُن سے بھی نیچے کہ وہ اپنے وجود کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں لیکن انسان کے وجود کا جو مقصد بنایا گیا ہے اس سے وہ گریز اور انحراف کا راستہ اختیار کرتا ہے ؎

اپنے مالک کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

خدا کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ انسان کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے اور اس کائنات سے خدا اور انسان کا کیا تعلق ہے؟ انسان کو اس زمین پہ کس طرح رہنا چاہیے اور جو سامانِ زیست اس کے چاروں طرف بکھرا پڑا ہے اُسے کن شرائط و حدود میں رہتے ہوئے اپنے دیگر

بنی نوع کے ساتھ کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ یہ سروسامانِ زندگی جو قیامِ زندگی میں ممد و معاون ہے کیا اس کا حصول ہی مقصد زندگی ہے یا سروسامانِ زندگی صرف قیام زندگی کا ذریعہ ہے۔ اور خود زندگی کا مقصود کچھ اور ہے۔ ان ساری باتوں کا جواب رسول ہی دے سکتے ہیں، جو خدا کے نمائندے، اس کے فرستادہ، اس کے دیے ہوئے علم کے حامل اور اُس کے بہت سے امورِ تکوینی کے عینی شاہد ہوتے ہیں اور اگر انہیں آگ میں جلا دیا جاتے یا پہاڑوں سے گرا دیا جاتے یا آروں سے چیر دیا جائے تو بھی وہ اپنے مشاہدہ اور علمِ حقیقی کی بنا پر اپنے مشاہدے اور علم کو جھٹلا کر اپنے موقف سے نہیں ہٹ سکتے۔ انبیاء میں سے کوئی نبی اپنے موقف سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا ہے۔ اس لیے کہ جو بات وہ کہتے ہیں اس کا علم انہیں عین الیقین کی حد تک حاصل ہوتا ہے اور کوئی شخص اپنے ذاتی مشاہدے کو اور اپنے حقیقی علم کو کسی دباؤ کے تحت بھی جھٹلا نہیں سکتا۔ کوئی شخص جلتے بوجھتے آگ کو برف اور پتھر کو رُوئی کیسے کہہ سکتا ہے۔

دُنیا کا کارخانہ وسیع و عریض ہے۔ کروڑوں اشیاء کی موجودگی میں کروڑوں افراد کے درمیان رہتے ہوئے فرائض و حقوق اور تعلقات کا پیچ در پیچ سلسلہ وجود میں آتا ہے — بے شمار افکار ہیں، متعدد راستے ہیں، بے نہایت نظریات، فلسفے اور دعوے ہیں — ان فرائض و حقوق و تعلقات اور ان افکار و نظریات و خیالات کے اُلجھے ہوئے راستوں کے گھنے جنگل میں انسان بالکل گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کی پیچ در پیچ گزرگاہ میں اسے صراطِ مستقیم کی طرف بلانے والی ایک ہی ہستی ہے۔ جو اُس کے سارے مسائل اور دکھوں کو سمجھ کر ان کا مداوا کرتی ہے اور وہ ہستی رسول کی ہستی ہے جو اس کی ہمدرد، غمخوار، دُکھ درد کی ساتھی اور دُنیا و آخرت کی حقیقی خیر خواہ ہستی ہے۔ یہ رسول پوری قوم کی آنکھ اور اس کا دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے۔ اس کے اشارے پر چل کر ہی کوئی قوم فلاح پا سکتی ہے۔ اور خسران سے بچ سکتی ہے۔

فرمایا گیا:۔

" وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)

پوری بنی نوع انسان کی دنیوی تاریخ کا ریکارڈ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ بے خبر انسان درحقیقت خسارے میں ہی ہے اِلّا یہ کہ وہ خدا اور اس رسولوں پہ ایمان لائے۔ ان کے احکام پہ عمل پیرا ہوکر اعمالِ صالح کرے۔ احکامِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرے اور اس راستے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں انہیں صبر سے انگیز کرے۔ خسران سے بچنے کی بس یہی واحد صورت ہے۔

اور یہ خسران کیا ہے؟

اللہ کی ہستی سے بے خبری اور بے پروائی کی حالت میں اپنی عمر کی ساری مدّت گذار دینا، اس کے احکام پہ چلنے سے گریز کرنا، رسولوں کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم سے انحراف کرکے زندگی کی گمراہ کُن پگڈنڈیوں پہ بھٹکتے پھرنا۔ اور مرنے کے بعد جب اعمال صالحہ کمانے کی مہلت پوری ہوچکے اور اچانک اُس حقیقتِ عظمیٰ سے دوچار ہونا پڑے کہ اس کائنات کا تو ایک خدا بھی ہے اور اس کے احکام پہ چلنا ہی اس کی زندگی کا محور و مقصود ہے۔ اور اس نے دُنیا میں اپنی ساری زندگی جو اپنے مقصودِ زلیست سے ہٹ کر گذاری ہے وہ تمام تر ضائع ہوگئی ہے۔ اب اس ہولناک تباہی سے بچنے کی کوئی صورت اور اس دُکھ کا اب کوئی مداوا نہیں ہے۔ بس یہی خسرانِ مبین ہے۔

انسان کو اس خسران سے بچنے کا راستہ انبیاء کرام ہی بتاتے ہیں۔ رسالت کا وجود ہی انسان کو خسران سے بچانے کے لیے ہے اور یہ خدا کی نہیں بلکہ بندے کی اپنی ضرورت اور احتیاج ہے جس طرح جسم کی زندگی کے لیے غذا بندے کی اپنی مادی احتیاج ہے اسی طرح رُوح کی فلاح و نجات کے لیے انبیاء کے طریقے پہ چل کر خدا کی بندگی کرنا بھی انسان کی اپنی روحانی احتیاج ہے۔

رسالت انسان کی حقیقی روحانی دست گیری کا کام کرتی ہے۔ اسے شیطان کی جھوٹی اور غلط کارروائیوں سے بچا کر رحمان کی مرضیات سے آگاہ کرتی ہے۔

انسان کی زندگی میں ایک خلاء ہے وہ اپنے آس پاس بہت کچھ دیکھتا ہے، لیکن اُسے

خالق اور صانع کی ہستی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ بادلوں کو برستے دیکھتا ہے، سورج کو چڑھتے اور ڈھلتے دیکھتا ہے۔ چاند کی گردش کو دیکھتا ہے، دریاؤں کی روانی، سمندر کے طوفان اور سرسبز درختوں کی ثمردار شاخیں دیکھتا ہے۔ وہ زمین کے ایک ہی گوشے سے بیک وقت میٹھے کھٹے پھیکے اور رنگ برنگ پھل اور پھول کھلتے اور پھلتے پھولتے دیکھتا ہے۔ وہ پرندوں کے جھنڈ دیکھتا ہے، وہ بچوں کو پیدا ہوتے پھر انہیں ماؤں کی گودوں میں بڑھتے، پروان چڑھتے، پرورش پاتے اور پھر ان کے انہیں چھوٹے چھوٹے جسموں کو پھیلتے اور طویل وعریض ہوتے دیکھتا ہے۔ وہ مویشیوں کے اسی پیٹ سے جہاں سبز چارہ جاتا ہے، سفید سفید دودھ برآمد ہوتے دیکھتا ہے، وہ قدم قدم پر حیرت و استعجاب کا شکار ہوتا رہتا ہے اور ان چیزوں کا عادی ہونے کے باوجود ذرا سا غور کرنے سے ہی وہ متحیر ہو کر رہ جاتا ہے اور سوچ بچار کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا جواب دینے کے لیے اس کے سامنے ایک ہستی نمودار ہوتی ہے جو اُس کے ایک ایک سوال کا جواب دیتی ہے اور یہ ہستی اس رسول کی ہوتی ہے جس کی تعلیم کا وہ مخاطب ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی روحانی ہستی کے خلا کو رسول ہی پُر کرتے ہیں۔ رسول دُنیا میں بھی انسانوں کے سامنے خدا کا گواہ ہوتا ہے اور آخرت میں بھی خدا کے سامنے اپنے منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا ذمہ دار اور گواہ ہوتا ہے۔ اس دوہری گواہی کے سبب وہ بے حد فکر مند ہوتا ہے اور ہمیشہ دعوتِ دین کے اس کام کو اپنے جسم وجان کی پوری توانائی صرف کر کے اور اپنے سارے دوسرے کام چھوڑ چھاڑ کر ...... سرانجام دیتا ہے اور اُس کے لیے اپنی توانائی، صلاحیت اور قوت اس انداز میں اور اس حد تک صرف کرتا ہے کہ حقیقتاً خدا کی حجت خدا کے بندوں پر اُس کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ رسول اپنے کام میں کبھی تساہل نہیں کرتا۔ وہ کبھی بے نیازی اور لاپروائی کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اللہ کے دین کی دعوت پیش کرنے کے بعد وہ کبھی مردم بیزاری اور گوشہ گیری کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ مسلسل اور متواتر ہر سمت اور ہر جہت سے قوم کے دل و دماغ میں اپنی بات اتارنے کی پیہم کوشش کرتا ہے اور اُس کے لیے ہر موزوں موقع، ہر بہتر انداز اور ہر اعلیٰ تدبیر اختیار

کرتا ہے۔ قومیں خدا کے سامنے کبھی اس امر کا ثبوت فراہم نہ کر سکیں گی کہ رسولوں نے ان تک دعوت نہ پہنچائی بلکہ رسولوں کا کیا ہوا کام اپنی اپنی قوم کے سامنے اتمام حجت کے لیے بہت کافی ہوگا اور کسی رسول کی قوم کا کوئی فرد اس حجت کے سامنے سر نہ اُٹھا سکے گا۔

خدا جو ہر شے کا خالق اور پروردگار ہے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر جبر کا رویہ اختیار کرے لیکن جبر کی صورت میں کسی نوع مخلوق کو اشرف المخلوقات قرار دینا، پھر اس کے لیے زندگی کا ایک وقفہ بطور امتحان مقرر کرنا اور پھر اسے ایک دائرے میں آزاد مرضی کا موقع فراہم کر کے آزمانے کا پروگرام ہی بیکار ہو جاتا، اس لیے کہ خدا نے انسان کو رسول کی تعلیمات تسلیم کرنے کے معاملے میں رائے اور عمل کی آزادی عطا کی ہے۔ اسی لیے رسولوں کی تعلیمات ہمیشہ انسانوں کے فہم و شعور کو اپیل کرتی ہیں۔ اور ان کے آزادئ رائے کے راستے سے ہی انہیں خدا کی بندگی کی طرف دعوت دیتی ہیں تاکہ جب وہ اپنی آزاد مرضی سے خدا کی بندگی اختیار کریں تو آخرت میں اعلیٰ مدارج اور خدا کی رضا کے حقدار بن سکیں۔ اسی لیے رسولوں کو قوموں کے اندر اس انداز میں بھیجا گیا کہ وہ سب سے قوی اور مقتدر ہستی کے نمائندے ہونے کے باوجود انسانوں کی آزاد مرضی کا تختۂ مشق بنتے رہے۔ انہوں نے ماریں کھائیں، وہ ظلم و ستم کا نشانہ بنے اور لوگوں کی مزاحمت و مخالفت سے انہوں نے سخت تکالیف برداشت کیں۔ اس طرح ایک طرف انسانوں کو فہم و شعور اور رائے کی آزادی فراہم کی گئی تو دوسری طرف انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے ہی اپنے سعید یا شقی ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا۔

رسالت انسانوں کے لیے رحمت ربانی ہوتی ہے جو بھٹکے ہوؤں کو راہ راست دکھاتی ہے گمراہوں کی دست گیری کرتی ہے۔ تاریکی میں ٹھوکریں کھانے والوں کو خدائی تعلیمات کا سورج دکھاتی ہے۔ اور جس کا وجود ہی خدا کے وجود کا اعلان ہوتا ہے۔ رسالت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی اس شان کی مظہر ہے جو انسان کی رُوح کی نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔ جو انسان کی رُوحانی غذا فراہم کرتی ہے، جو انسان کو حیوانی سطح سے اُٹھا کر اشرف المخلوقات کے مقام پر متمکن کرتی ہے۔ جو دلوں کا نور ہے، جو دماغوں کی قندیل ہے، جو رُوحوں کی رہنما ہے۔ جو آخرت کی چشم دیدگواہ ہے۔ جو مرضئ مولا سے اس کے غلاموں کو آگاہ کرتی اور ان پر حجت قائم کرتی اور بندوں کی طرف

سے اپنے مالک کے سامنے معذرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی ہدایت کا سایہ ٹھنڈا، جس کی تعلیم کا پانی شیریں اور جس کی رہنمائی کا ثمر لذیذ، روح پرور اور بابرکت ہے۔ جس کے بغیر انسان صرف حیوانِ ناطق ہے اور جس کی دست گیری سے محروم انسان کے لیے مہذّب ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے بغیر انسان اگر ہتھیار بناتا ہے تو اپنے گلے کاٹنے کے لیے، اگر دوا بناتا ہے تو بنی نوع انسان کے جسموں میں زہر کے ٹیکے لگانے کے لیے اور اگر لباس پہنتا ہے تو پوشش ستر کے لیے نہیں بلکہ نمائش ستر کے لیے۔ رسالت انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے، اس کے بغیر انسانیت وہ حیوانیت ہے جو اپنی حیوانیت کی نمائش کا زیادہ سے زیادہ اعلان و اشتہار ہے اور جو اپنے ہی پاؤں کی ٹھوکر سے اپنی ہی ہستی کے چور لہے پر اپنے ہی بنی نوع کے سامنے ذلیل و رسوا اور خوار و زبوں ہو کر رہتی ہے۔

انسان میں آج نیکی و بدی کا جو شعور ہے وہ اس رسالت کا ہی عطا کردہ ہے۔ ہر دَور میں انسان کے پاس خدا کے نمائندے رسول آتے رہے ہیں۔ ان کی تعلیمات نے انسانوں کی ہمیشہ رہنمائی کی ہے۔ اس رہنمائی میں اغراض و مفادات اور تعصب و جہالت کی آمیزش سے جو ٹیڑھ اور کجی بعد کے لوگ پیدا کرتے رہے ہیں اس کے باوجود نیکی اس لیے اچھی ہے کہ وہ نیکی ہے اور بدی اس لیے بدی ہے کہ اس کے کرنے سے میثاقِ ازل کا گواہ انسانی ضمیر ناخوش اور غیر مطمئن رہتا ہے۔ یہ شعور رسولوں کی تعلیمات کا ہی نتیجہ ہے اور کوئی بڑے سے بڑا یا بُرے سے بُرا انسانی معاشرہ بھی اس شعورِ نیک و بد سے محروم و بے خبر نہیں ہے۔ جنگلوں کے وحشی قبائل اور متمدن شہروں کے مہذب شہری سب کے اندر یہ مشترک شعور پایا جاتا ہے اور یہ رسالت کے عطیات کا ہی نتیجہ ہے۔

ہر دَور میں رسول مختلف قوموں کی طرف آئے اور وہ اپنے ہمراہ کھلی کھلی واضح نشانیاں لائے۔ وہ کتابِ الٰہی کا علم لائے اور خود حق و ناحق کا معیار بن کر آئے۔ انہوں نے افراد اور قوموں میں انصاف کی بنیادوں کو مستحکم کیا، انہوں نے اخلاق اور مساواتِ انسانی کا عَلم بلند کیا، انہوں نے انفرادی زندگی کے اصول اور اجتماعی زندگی کے قوانین بیان کیے۔ انہوں نے جس معاشرے میں بھی کام کیا وہاں توازن و مساوات، عدل، انصاف، اخوت، نیکی، ہمدردی اور بھلائی کی قدریں پھیل گئیں۔ وہ انسانی معاشروں میں خوشبو بن کر آئے اور نیکیوں کا باغ لگا کر تشریف لے گئے۔

بلاشبہ سارے ہی رسول انسانیت کے مہکتے ہوئے پھول تھے۔

رسولوں کے ذمہ ہمیشہ یہی فریضہ رہا کہ وہ اللہ رب العالمین کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ ان کا پیغام ہمیشہ ایک ہی تھا۔ ان سب کا پیش کردہ دین بھی ایک تھا، وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے۔ وہ اصول جو روز ازل سے بندگی، اطاعت اور تہذیب و شائستگی کے مقرر کر دیے گئے تھے وہ سب انہیں اصولوں کے مبلغ تھے۔ ان کے ذمے یہی تھا کہ اپنی تبلیغ کے زور سے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کو علیحدہ علیحدہ ممتاز گروہ بنا دیں تاکہ بندگی اور بغاوت کی آمیزش نہ رہے اور خدا کے دیے ہوئے اصول و قوانین اطاعت گزار بندوں پر پورے کے پورے نافذ ہوں۔

رسولوں کے ذریعے خدا کا ارسال کردہ دین اور نظام زندگی قوموں کے لیے محض اصلاح مذہب کی کسی تجویز پر مشتمل نہیں رہا ہے۔ یہ پوری انسانی زندگی کو خدا کی بندگی میں لینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان کی زندگی کے سارے شعبوں میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت جاری کرنے کا سلیقہ سکھایا گیا اور جب کبھی زمین پر وہ اصول نافذ ہوئے، زمین باغِ جنت کا نمونہ بن گئی۔

رسولوں کا یہ سلسلہ ہر دَور میں اور ہر قوم میں مسلسل جاری رہا اور اللہ کا دین انسانی شعور کی ترقی اور انسانی تہذیب و تمدن کی وسعت کے ساتھ انسانی زندگی کے زیادہ سے زیادہ دائرے پر بار بار جاری ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ رسولوں کا سنہری سلسلہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس سلسلے کے آخری رسولؐ تشریف لائے جو عمارتِ نبوت کی آخری اینٹ تھے جو باغِ رسالت کے مہکتے ہوئے آخری پھول تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے نامِ نامی سے ساری دُنیا آگاہ ہے۔

ان کا دَور قدیم دُنیا کے خاتمے کا اور جدید دنیا کے آغاز کا دَور تھا۔ وہ دُنیا کے وسط میں کھڑے ہو کر پیغامِ حق دے رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو زمانہ گذر گیا تھا وہ انسانی شعور کے ادھورے اظہار کا دَور تھا۔ اب انسانی شعور پوری طرح بالغ ہو کر سامنے آگیا تھا اور انسانی زندگی کی تمام وسعتیں اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ نمودار ہو رہی تھیں۔ انسانیت کو

جن اصولوں کی ضرورت تھی اور جس انداز کا طرزِ حیات مطلوب تھا اس کا نمونہ حضورؐ اکرم کی تعلیمات میں پورے طور پر سامنے آ گیا۔ اب وہی قدیم سادہ سی تبلیغِ کلماتِ ربّانی کی دعوت ایک عظیم انقلابی تحریک بن کر اٹھی تھی جس کا کام دین کو غالب کرنا تھا۔ انسانیت کو اپنی زندگیاں خالص اللہ کی بندگی میں گذارنے کے لیے جس نوعیت کے احکام کی ضرورت تھی وہ سارے ہی احکام اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اور وہ سارے ہی اصول اپنی تمام بنیادوں کے ساتھ سامنے آ گئے۔ ان کے نفاذ کے لیے جد و جہد ہوئی۔ اس تحریک کی زبردست مزاحمت ہوئی۔ مزاحمتوں کو توڑ کر حق کی تعلیمات کو سربلند اور نافذ کرنے کا راستہ بنا دیا گیا۔ اور دنیا میں پہلی بار یہ وقوع ہوا کہ جو کچھ آسمان سے نازل ہوا وہ سب کچھ اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ زمین پر نافذ ہو گیا۔ تب وہ تاریخی ارشاد نازل ہوا جس پر یہود نے رشک سے کہا تھا کہ اگر ہمارے دین میں ایسی آیت آتی تو اسی روز کو ہم روزِ عید قرار دیتے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

اس طرح شانِ ربوبیت نے انسانیت کی روحانی احتیاج قیامت تک کے لیے پوری کر دی۔ سلسلۂ نبوت ختم ہوا۔ اللہ کا دین کامل ہوا۔ محمد رسول اللہ قیامت تک کی انسانیت کے قائد اور ہادیٔ برحق قرار دیے گئے (صلّی اللہ علیہ وسلّم)۔

حیاتِ انسانی کا مقام

رُوح اور نیچر کے تسلسل میں

از
ڈبلیو۔ ہیٹلر (W. HEITLER) پروفیسر ایمریطس طبیعیاتِ نظری
(THEORETICAL PHYSICS) یونیورسٹی آف زیورک (ZURICH) سوئٹزرلینڈ
مترجم: خورشید رضوی

مسٹر ڈبلیو ہیٹلر (W. HEITLER) کے ایک بیش قیمت مضمون کا اُردو ترجمہ ہم ان صفحات میں پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس مضمون میں کائنات اور حیات اور انسان کے متعلق جو فلسفیانہ سائنسی بحث چھیڑی گئی ہے وہ مادّی تصورِ کونیات کی بنیادیں ہلا دینے والی ہے۔ نتیجۃً نظریۂ ارتقاء بھی اس کی زد سے نہیں بچتا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس کی وادیوں کو طے کرتی ہوئی انسانی فکر آخرِ کار میٹریلزم کی ان رکاوٹوں کو توڑ رہی ہے جو انسان اور خدا کے درمیان حائل کر دی گئی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض قارئین کو فلسفیانہ مباحث کا ذوق نہ ہو لیکن ایک بڑی تعداد اِس مضمون کو پسند کرے گی اور اس کے زیرِ اثر سوچنے کی مزید راہیں کھلیں گی۔

ہم اپنے ہاں کے مادّہ پرستوں اور لادینیت پسندوں کو بھی توجہ دلاتے ہیں کہ انکارِ خدا اور ترکِ مذہب و اخلاق کے جس فیشن کو انہوں نے اپنا رکھا ہے، اب وہ نہیں چل سکتا۔ اور ہم اپنے دانشوروں اور پروفیسروں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس طرزِ فکر سے سوچیں اور ایسے مباحث سامنے لائیں۔ الحاد و مادیت، مغرب کے اُگلے ہوئے نوالے ہیں، اور ان کو نگلنے اور چبانے پہ فخر کرنے کا دَور ختم ہو چکا۔

(ن ص)

شاید کسی بھی دور میں انسان اپنی فطرت کے بارے میں اتنا متردد نہ تھا جتنا آج ہے۔ سائنس کے مستند زعمار تو ہمیں یہ باور کرا چکے ہیں کہ ہم ایک "پیچیدہ طبیعاتی و کیمیادی نظام" سے عبارت ہیں۔ نیز یہ کہ بنیادی طور پر ہم نکلیوٹائڈز (NUCLEOTIDES) کا ایک سلسلہ ہیں جس کا طول تقریباً دو میٹر ہے ——— (یہ ہمارے کروموسومز میں DNA MOLICULES کی کل لمبائی ہے) ——— یا یہ کہ ہمارا ظہور عملِ ارتقاء کے دوران محض ایک اتفاقی حادثہ تھا ------- یا ایسے ہی بعض اور رائج الوقت پوچ نظریات -------

میری نظر میں تو ہماری اس ابتری حواس کا سبب حقیقت الوجود (ONTOLOGY) کے شعور کا قریب کامل فقدان ہے۔ یعنی "کیف" اور "جوہر" کی سطح پر جو کچھ "ہے" اس کے "ہونے" کے ادراک کا فقدان - نیز اس ادراک کا فقدان کہ وجود کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے کس انداز میں مختلف و متباین ہیں ——— بایں ہمہ ان امور کے ضمن میں ایک خاص انداز کی بصیرت کم از کم ارسطو کے زمانے سے چلی بھی آتی ہے۔ تاہم آج صورت حال اس امر کی متقاضی ہے کہ از سرِ نو غور و تدبر کے بعد علمِ جدید کی روشنی میں اسے ایک یکسر مختلف ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے۔

انسان (بیک وقت) کئی عالموں کا مکین ہے۔ ایک طبیبِ جسمانی بھی اس وقت تک صحیح معنوں میں امداد پہنچانے سے قاصر ہوتا ہے جب تک کہ اسے انسان کی تمام تر "حدودِ وجود" کا شعور حاصل نہ ہو...... یہ ایک حقیقت ہے!...... حالانکہ طبی معالجے کو ——— (ہمارے علم کی انتہائی قلت کے باعث) ——— ان عالموں میں سے صرف ایک ہی عالم یعنی عالمِ مادی پہ اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا ہوتی ہے۔

انسان ایک اعتبار سے نتیجۂ فطرت (A CREATURE OF NATURE) "بھی" ہے۔ لہٰذا انسان کو سمجھنے کے لیے اشیائے فطرت سے آغاز کرنا بھی ناگزیر ہے۔ بلکہ بنظرِ غائر دیکھیے تو ہمیں علم ریاضی سے آغاز کرنا ہوگا جو ——— (ہر چند کہ "اشیائے فطرت" میں شامل نہیں) ——— علمِ طبیعیات سے کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہے کہ دونوں کا جائزہ ہمیں ایک ساتھ ہی لینا ہوگا۔ علم ریاضی کا وجود عالمِ روح میں ہوتا ہے۔ "نقطہ" ہو یا "دائرہ" یا "عددِ غیر ناطق" (IRRATIONAL NUMBER)، ان میں سے کوئی بھی مادی طور پر موجود نہیں۔ سوال

یہ ہے کہ کیا ان کا وجود صرف "ہمارے "ذہن اور رُوح میں ہوتا ہے ؟ .... کیا اس بات کا امکان ہے کہ یہ انسانی اختراعات ہوں ؟ —— یا اُن کا کوئی خارجی و حقیقی وجود بھی ہے !— ایسا وجود جیسے کسی ماورائی عالم کا وجود کہا جاسکے ۔ یعنی ایک روحانی عالم جو بنیادی طور پہ انسان سے الگ اور آزاد ہے ؟ —— اس سوال نے صدیوں سے مسلسل علمائے ریاضی کو محوِ غور رکھا ہے ۔ چنانچہ افلاطون کا خیال تھا کہ ریاضیاتی تصورات دراصل " اعیان " یا " امثال " (IDEAS) ہیں ۔ یعنی مجرد بنیادی ہیولے (SPIRTUAL PROTOTYRES) جو ایک ماورائی دنیا سے وابستہ ہیں اور مادّی صورت میں اپنا ایک نہایت ہی ناقص سا اظہار کر سکتے ہیں —— (مثلاً دائرے کی شکل تو محض پنسل کے سُرمے کے ذرّات کا ایک سلسلہ ہے) —— ان خالص تجریدات (PURE ABSTRACTIONS) کا انسانی تصور، بنیادی ہیولوں کے ادراک پہ ، یعنی ماورائی دُنیا کی ایک جھلک دیکھ لینے پہ منحصر ہے —— (جسے عرفِ عام میں " الہام " یا " وجدان " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) —— اکثر سربرآوردہ ریاضی دان، اسی افلاطونی نظریے کے قائل تھے اور آج بھی ہیں۔

دونوں نقطہ ہائے نظر کے مابین حتمی فیصلہ علم طبیعیات کے حوالے سے ممکن ہے ۔ طبیعیاتی اصول بےجان مادّے کے طریقِ عمل (BEHAVIOUR) کی وضاحت کرتے ہیں ۔ یہ اصول بلا استثناء کُلّی ریاضیاتی اصطلاحات سے منضبط کیے جاتے ہیں ۔ مادّہ اِن اصولوں کی متابعت کرتا ہے ۔ —— (لیکن متعدد رکاوٹوں کے باعث یہ متابعت ہمیشہ نامکمل انداز میں ہوتی ہے) —— صاف ظاہر ہے کہ علمِ ریاضی ، جس کا ظہور اِن اصولوں کی صورت میں ہوتا ہے ، بھی مادّے پہ اثر انداز ہوتا ہے مگر طبیعیاتی اصول ہماری اختراع نہیں ہیں ۔ یہ " فطرت " کے قوانین ہیں ۔ بنا بریں ، علمِ ریاضی بھی انسانی اختراع نہیں ہے ۔ اس کا ایک حقیقی وجود ہے —— یعنی ایک ماورائی عالم میں وجود —— کیونکہ فی نفسہٖ یہ علم مادّی نہیں ہے ۔

افلاطونی نظریے کے مطابق خود اصول طبیعیات بھی بنیادی ہیولے (PROTOTYPES) تصور کیے جائیں گے ۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک " شئیِ مجرّد " ہیں ۔ لیکن یہاں افلاطونی نظریے سے ایک اُصولی بُعد پایا جاتا ہے ۔ یہ بنیادی ہیولے محض ایک " افلاطونی جنّتِ خیال " ہی میں وجود

نہیں رکھتے۔ جنہیں خالص "امثال" یا "اعیان" کہا جاتا ہے کہ جو "مادی آلودگی" سے یکسر مبرا ہوں۔ اس کے برعکس یہ اصول مادّے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگرچہ مادہ اُن کی متابعت میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔

اصول طبیعیات بے جان مادّے کے طریقِ عمل کو سختی سے اپنا پابند رکھتے ہیں۔ وقت کے کسی بھی لمحۂ مخصوص میں، مخصوص حقائق نیز خارجی مؤثرات مل کر آنے والے احوال کا رُخ متعین کرتے ہیں

(۲)

اب ہم فطرت کے جاندار (ANIMATE) مظاہر کی طرف آتے ہیں۔ اور آغاز نباتی زندگی سے کرتے ہیں۔ ہم صرف ترقی یافتہ اجسام پر توجہ دیں گے مثلاً گلِ مروارید (DAISIES) یا صنوبر کے درخت ــــــ (اسی طرح آئندہ بحث میں کتے یا بندر) ــــــ نہ کہ وائرس اور بکٹیریا۔ سادہ ابتدائی اجسام (PRIMITIVE ORGANISMS) کے بارے میں نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ و پیچیدہ اجسام کے حوالے سے نتائج اخذ کیے جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ممکن نہیں۔ چنانچہ وائرس کے مشاہدے سے صنوبر کے بارے میں آگہی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

یہاں ہمارے سامنے یکسر مختلف قوانین و تصورات ہیں۔ کلیدی الفاظ ہی مثلاً ہیئت (FORM) نظامِ ساخت (STRUCTURAL PLAN)، پابندیٔ جہت (DIRECTEDNESS) اور کلیت (WHOLENESS)، اپنے وجود اور طریق عمل میں بے جان مادّے سے بعض بنیادی اختلافات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ تصورات، علم طبیعیات کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ پودا ایک بارور تخمی خلیے (FERTLISED GERM CELL) سے نشوونما پاتا ہے۔ اس میں وہ پیچیدہ کیمیاوی و طبیعی عمل شامل ہے جو پہلے تو خلیے کی تقسیم اور پھر پودے کی "ہیئت" کے تدریجی ارتقاء، نیز اپنے اپنے مخصوص مقامی عمل کے اعتبار سے الگ الگ خلیوں کی تفریق و تمیز کا کام انجام دیتا ہے۔ یک برگی خلیے (LEAF CELL) کا عمل یک جذری خلیے (ROOT CELL) سے جداگانہ ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ سب عمل ایک خاص ہدف کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ ہدف اُس شے کی تکمیل ہے جسے ہم "پودے کا

کا نظامِ ساخت" کہتے ہیں - نادیدہ و مخفی طور پر یہ سارا نظام پہلے ہی سے تخمی خلیئے میں مضمر ہوتا ہوتا ہے اور اُس مخصوص پودے کی نسل کی تمام تر خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے - نظامِ ساخت اس امر کا تعین کرتا ہے کہ پودے کی نشوونما کا انداز اور بالآخر اُس کی شکل و شباہت کیسی ہوگی اور ہر حصّے کا مخصوص عمل کیا ہوگا - پتّوں کا کام تنفّس ہوگا، جڑیں پانی جذب کرنے کا کام کرنے اور پھولوں کے زردار زرحصّے (STAMENS) مادہ حصّے (PISTIL) کو بارور کرنے کا کام سرانجام دیں گے - وغیرہ وغیرہ......

ایک نامیاتی جسم واضح طور پر ایک الگ اور منفرد اکائی ہوتا ہے - اگرچہ گردوپیش سے تاثیری و تاثری سطح پر اُس کا گہرا ربط ہوتا ہے - بے جان مادہ بنیادی طور پر محض ایک انبار یا ڈھیر (MASS) ہوتا ہے - ایک بالٹی پانی سے لبالب بھری ہوئی ہو یا نصف، — یہ فرق محض کمیت کا فرق ہے - لیکن گُل مروارید کا وجود صرف "انبارِ مروارید" یعنی الگ الگ پھولوں کی تعداد سے عبارت نہیں جن کو شمار کیا جاسکتا ہو - کلّیت، پودے کے تمام تر اجزأ کی متقاضی ہے - اگر ہم جڑیں کاٹ ڈالیں تو نئی جڑیں نکل آئیں گی —— (وہی کلیت کی بحالی کا عمل ہو مثلاً قلموں (CUTTINGS) کی صورت میں بروئے کار آتا ہے) —— ورنہ پودا مرجائے گا - پودے کے اندر جاری رہنے والے مختلف عمل، کلیت کی تشکیل نیز پودے کے عرصۂ حیات میں اس کی تغیر پذیریوں میں ممد ہوتے ہیں - مختلف کیمیاوی و طبیعی عمل بھی اسی جہت کے پابند کر دیے جاتے ہیں -

ظاہر ہے کہ مرکز میں کہیں حکمران کی سی حیثیت رکھنے والی کوئی شے موجود ہے جو ان سب اعمال کو نظامِ ساخت کے مطابق چلاتی ہے - ہم اِس شے کو "وجودِ باطنی" (INNER BEING) کا نام دیتے ہیں - یہ اُن حیاتیاتی قوانین پر مشتمل ہے کہ تمام عمل جن کے متبع ہوتے ہیں - اُسے کئی اور ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے -

جو سائنسدان اس قسم کے وجودِ باطنی کا حوالہ دیتے ہیں، اس اعتبار سے مطعون کیے جاتے ہیں کہ وہ ایک غیر سائنسی اور متصوفانہ شے کو درمیان لا رہے ہیں - تاہم وجودِ باطنی اپنے نظامِ ساخت کے ساتھ کم و بیش اُسی قدر "متصوفانہ" قرار دیا جاسکتا ہے جس قدر، مثال کے طور پر،

کششِ ثقل یا تجاذب کا قانون .... دونوں غیر مرئی ہیں اور ایک ماورائی عالم سے متعلق ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ باطنی وجود کا تعلق ایک منفرد پوٹے سے ہے جبکہ قانونِ تجاذب پورے عالمِ مادّی پر حاوی ہے۔

وجودِ باطنی مختلف عملوں کو ایک معین جہت پر چلاتا ہے تو کیا طبیعیاتی عملوں کی جہت معین کرنا ممکن ہے؟ ..... حقیقت یہ ہے کہ نہیں! ہرگز نہیں! ___ اس وقت جب تک کہ طبیعیاتی قوانین بے رکاوٹ بروئے کار نہ آجائیں۔ اور یہ قوانین سخت لگے بندھے طریقِ عمل کے متقاضی ہیں۔ سو اگر طبیعیاتی عمل، وجودِ باطنی کے اشارے پر چلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حیاتیاتی قوانین، کیمیاوی وطبیعی قوانین پر بالادستی رکھتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ "قوانین کے حفظِ مراتب" کے اعتبار سے حیاتیاتی قوانین کا رتبہ طبیعیاتی قوانین سے برتر ہے۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ جسم میں کیمیاوی وطبیعی قوانین کا اعتبار و اقتدارِ مطلق کسی نہ کسی حد تک پابند و اسیر بھی ہے۔ یہ ایک ایسا استنباط ہے جس کے نتائج بڑے خطیر ہوں گے لیکن اسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ بہت سے ماہرینِ علم الحیات اس مفروضے کو ترجیح دیتے ہیں ___ مگر اس صورت میں یہ شرط از خود عائد ہو جاتی ہے کہ وہ آزاد حیاتیاتی قوانین کے وجود کو تسلیم کرتے ہوں، ___ کہ حیاتیاتی وطبیعی قوانین دست بدست اور پہلو بہ پہلو چلتے ہیں، لیکن یہ ناممکنات میں سے ہے۔ علم طبیعیات، قوانینِ فطرت کے عالی شان صحیفے میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تو حرفِ اوّل ہے۔ جس کے بعد دیگر نوعیت کے اور قوانین آتے ہیں مثلاً موضوعِ زیرِ بحث ہیں۔ نباتی زندگی کے قوانین، جو باعتبارِ رتبہ برتر اور فائق تر ہیں۔

ایک جسمِ نامی کا مادّہ کسی بھی طرح کے احوال و ظروف میں بے جان مادّے جیسا وجود نہیں رکھ سکتا۔ اوّل الذکر کے لیے علم طبیعیات کو کسی نوع کا اعتبارِ مطلق حاصل نہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں حیاتیاتی قوانین کو درمیان لانے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ ہم ایک جسمِ نامی کے مادّے کو "جاندار" تصور کرتے ہیں۔ ایک خلیے کا پروٹوپلازم تک "جاندار" ہوتا ہے یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے کہ اس میں "زندگی کے اوّلین مرحلے" کی نمائندگی موجود ہوتی ہے جس کے بعد دوسرے مراحل کو آنا ہوتا ہے۔ ہم قریب قریب یکسر لاعلم ہیں کہ زندگی کی اس صورت کو کیا قرار دیں۔ اس ضمن میں بعض قوی مفروضات

موجود ہیں لیکن اُن کی تفصیل میں جانا یہاں مناسب نہیں۔

اعتبارِ مراتب کا اصول خود ایک جسم نامی میں داخلی طور پر بھی کارفرما ہے۔ مختلف اعضاء ——— (مثلاً پتہ، جڑ، غنچہ و گل) ——— اپنی اپنی جگہ مستقل اکائیوں کی صورت میں منظم ہیں۔ اگرچہ وہ سب "مجموعی پودے" کے تابع ہیں۔ اِسی طرح خلیہ اپنی جگہ اعضاء کا تابع ہے ——— (اگرچہ اس نظام میں وہ خود ایک مستقل اکائی بھی ہے) ——— اور پھر اُس کے بھی کچھ ذیلی اجزاء ہیں۔

(۳)

آیئے اب حیوانات کا جائزہ لیں۔ یہاں پھر ایک بار ہمیں ایک یکسر نئی صورتِ حال کا سامنا ہے۔ جذباتی تجربات، رنگ اور بُو کے محسوسات، رنج اور راحت جیسے احساسات۔ پھر یہاں ایک حرکی نظام بھی موجود ہے ..... ہاتھ پاؤں جبڑے وغیرہ کی جنبش۔ اور ان دونوں خصوصیات کی اساس نظامِ اعصاب پر ہے۔

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حسّی ادراک کا عمل یوں واقع ہوتا ہے:۔

کوئی خارجی مادی محرک مثلاً کوئی شعاعِ نور، آنکھ میں داخل ہوتا ہے اور پردہ چشم تک پہنچتا ہے۔ بعدازاں بصری اعصاب اس محرک کو ایک برقی رَو یا ایک منقلوب کیمیاوی ——— (CHEMICAL TRANSFORMATION) ——— کی صورت میں دماغ کے بعض مخصوص خلیوں تک منتقل کرتے ہیں۔ جہاں جا کر اس محرک کا ادراک، شعوری سطح پر، روشنی کے احساس کے طور پر کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ امر آج تک ایک رازِ سربستہ چلا آتا ہے کہ ایک مادی یا کیمیائی محرک ایک لرزش احساس کی صورت کیونکر اختیار کر لیتا ہے۔

حواس کی فعلیاتی کیفیات پر گذشتہ چند دہائیوں میں جو کچھ تحقیق ہوئی ہے۔ اس سے ایک بالکل ہی نئی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ خارجی محرک سب سے پہلے ذاتی میلانات کے عملِ تقصیر و تجلیل (DAMPING & AMPLIFICATION) سے گزر کر نظامِ اعصاب میں یکسر منقلب ہو جاتا ہے۔ یہ عمل "باطن" میں بروئے کار آتا ہے ..... یعنی کسی شے کے شعور میں منتقل ہونے سے قبل ایک ماورائی جہت سے ..... (جو

نہ تو مادّی ہے اور نہ فعلیاتی ★۔

جو مادّی محرّک ہمارے سامنے ہوتا ہے وہ تو ہمیں سرے سے نظر ہی نہیں آتا ——— وہ تو محض ایک رنگدار سطحوں کی پچّی کاری ہے ——— ہم تو جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ایک درخت، ایک میز یا ایک گلدان ہو سکتا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر "اشکال" .... صرف "بامعنی" اشکال یا پیکر ہی شعور کی سطح پر اُبھرتے ہیں۔ مگر یہ پیکر ہمارے سامنے اسی وقت جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جب (خارجی) محرکات ایک قلب ماہیت سے گذر چکے ہوتے ہیں۔

یہی بات آنکھ کی اِس قابلیت سے خارج ہوتی ہے کہ وہ ان پیکروں کو دیکھ سکتی ہے جو واضح و متمیّز (SHARPLY DEFINED) ہوں۔ آنکھ پیکروں کو فوکس (FOCUS) میں لانے کے لیے گنجائش پیدا کرتی ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے ——— ؟ آنکھ کو آخر یہ بات کیسے معلوم ہے کہ "فوکس میں ہونا" کسے کہتے ہیں ؟ ——— آنکھ کو کس نے بتایا کہ ایک واضح و متمیّز پیکر اس کے حسب حال ہے ؟ ——— بالیقین تنہا علم طبیعیات اس قسم کے تاثر کو مفہوم عطا کرنے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ، کسی نہ کسی طرح "باطن" سے اُبھرتا ہے۔ لیکن ایسے انداز میں کہ ہم ——— (یا حیوانات) ——— اس کا شعور نہیں کر پاتے۔

یہی بات سب کے سب حسّی ادراکات پر صادق آتی ہے۔ جانوروں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ ایک چوزہ زمین پر پڑے ہوئے دانے کی بیضوی شکل سے زیادہ کچھ نہیں دیکھ پاتا۔ اسی طرح اکسی شکاری پرندے کا سایہ، نیز مرغ ٹھونگیں مارنے میں خود سے برتر یا کمتر مرغیوں کو دیکھتا ہے۔ الغرض چوزہ صرف وہ کچھ دیکھتا ہے جو "چوزہ ہونے کی حیثیت" میں اُس کے لیے "بامعنی" ہے۔

نظامِ اعصاب، اور اس سے متعلق ادراکات و محسوسات، ایک "کُل" بناتے ہیں جس کی ماہیت ہمارے لیے ہنوز یکسر ناقابل فہم ہے۔ اِسے نہ تو ایک ترکیب مادّی کی حیثیت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ خالص نفسیاتی حوالوں سے۔ یہ دونوں پہلو باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ نظامِ اعصاب کا

★ NON-MATERIAL, NON-PHYSIOLOGICAL

فہم تنہا طبیعیات کی مدد سے حاصل کرنا خارج از امکان ہے۔ صرف طبیعیات کام نہیں دے سکتی۔ کیونکہ افعال الاعضاء کے جتنے عمل ہیں ان پر باطن اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہ "باطن" کوئی مادی عامل نہیں۔ طبیعیات کی کتابیں ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ "بامعنی پیکر سے ہم کیا مراد لیں۔

روزمرہ کے نہایت سادہ تجربات اس چیز کی توثیق کرتے ہیں۔ اگر ہم ہر نوع کے احساسات و تاثرات، نیز قوت ارادی کے ان عمومی میلانات کو، جو عضلات کو حرکت میں لاتے ہیں، اختصار کی غرض سے "سائیکی" یا "نفس" کا نام دے لیں تو یوں کہنا ہوگا کہ سائیکی کے ارتعاشات مادی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں اس حقیقت سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ہم حیوانات سے چنداں مختلف نہیں ہیں۔ ڈر کے نتیجے میں کپکپی، یا اختلاج قلب پیدا ہوجاتا ہے۔ کسی قسم کا خوف ہم سے دورانِ خون کو سلب کرلیتا ہے۔ لہٰذا ہم زرد پڑجاتے ہیں ...... (یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں) اس کے پسِ پردہ کونسی شے کارفرما ہے؟ یہ درست ہے کہ ابتدائے خوف سے لے کر اختلاجِ قلب تک، لاتعداد عضوی افعال اور طبیعی وکیمیاوی عمل، دماغ، نظامِ اعصاب اور بالآخر عضلۂ قلب میں واقع ہوتے ہیں۔ لیکن عملاً جو کچھ ہوتا ہے وہ بڑی سادہ سی بات ہے۔ یعنی ایک نفسیاتی عمل ـــ خوف ـــ کے نتیجے میں ـــ (کسی پیچیدہ سے طریق پر) ـــ مادی اثرات پیدا ہوجاتے ہیں جو انتہائی شدید نوعیت بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ خوف کو طبیعی قوتوں کے پیمانے پر کسی قوت کے طبیعی نتیجے کی حیثیت سے پیمائش میں لانا ممکن نہیں۔

چنانچہ ایک بار پھر یہی بات سامنے آئی کہ عالمِ طبیعیات اس سارے عمل میں ایک حد تک محکوم ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جانوروں میں، یعنی جاندار ہستیوں میں، جو سائیکی رکھتی ہیں طبیعیات کا اعتبار مطلق اور بھی محدود ہے۔ یہاں ایک تیسری نوعیت کا مرحلہ "تاثیرات ـــ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر ـــ نباتی زندگی پر بھی تسلط رکھتا ہے۔ اور طبیعی و نباتی ہر دو انواع کے قوانین حیات پر تفوق حاصل کرسکتا ہے۔ یہ تیسرا مرحلہ "نفسی تاثیرات" سے عبارت ہے۔

اس اعتبار سے حیوانی جسم خود کو ایک ایسی حالت میں پاتا ہے جو ان احوال سے مختلف ہے جن سے خالص نباتی زندگی کا توافق ہوسکتا ہے اس کا نظامِ اعصاب علی الخصوص ـــ اور نظامِ اعصاب کی وساطت سے سارے کا سارا جسم ـــ (جو نظامِ اعصاب سے الگ نہیں) ـــ

حیاتیت کی ایک نئی سطح پہ فائز ہو جاتا ہے ۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ "نفس" یا "سائیکی" کی نعمت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے ۔

ہم اس بحث سے نتائج و قوانین اخذ کرتے ہیں۔ نیز مادے کی حیاتیت کے مختلف مدارج کے مابین جو خطوطِ فاصلہ کھینچے رہے ہیں انہیں ضرورت سے زیادہ باضابطہ تصور کر لینا مناسب نہ ہوگا ۔ بین المراحل بہت سے مرحلے موجود ہیں ۔ اور ہر سطح پہ زبردست استثنا بھی ہیں ۔ چنانچہ وائرس جاندار اور بے جان کے مابین ایک مرحلے کی نمائندگی کرتے ہیں وہ جاندارانہ خصوصیات کا اظہار صرف اسی صورت میں کرتے ہیں جبکہ وہ زندگی کی بعض دوسری صورتوں میں منسلک ہو جاتے ہیں ۔ الجا (ALGA) اور سیب کے درخت میں بے حد تفاوت ہے اور یہ تفاوت صرف حجم تک محدود نہیں ......

ایک کینچوے کی حیاتِ باطنی ۔۔۔ یا سائیکی ۔۔۔ بڑی سادہ و ابتدائی نوعیت کی اور ایک کتے کی سائیکی سے بے حد مختلف ہوتی ہے ۔ جمادی ، نباتی اور حیوانی زندگی ۔۔۔ (جس میں سائیکی کا ظہور ہو چکا ہو) ۔۔۔ کی بے حدودِ فاصلہ ابھر کر ، اور بھرپور انداز میں صرف ترقی یافتہ جانوروں میں سامنے آتی ہیں ۔

ہم از بسکہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حیوان اور انسان کے مابین ایک واضح خطِ امتیاز کھینچیں ، خصوصاً اس لیے کہ یہ ایک رائج الوقت دستور بن چکا ہے کہ انسانی اور حیوانی رویّے کو ایک ہی روشنی میں دیکھا جاتا ہے ۔۔۔ (اور یہ ہمارے دَور کے عمومی رجحانِ خودکشی کا ایک پہلو ہے) ۔

اوزاروں کی ایجاد کو بالعموم انسانی وجود کی صبحِ اولین سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ بیور (BEAVER) مارموٹ (MARMOT) اور عنکبوت جیسے حیوانات کے ہندسی کمالات اُن کے آزادانہ و بلا شرکتِ غیرے کمالات نہیں ہیں ۔ یہ تو جبلی اعمال ہیں جو اِن جانوروں کی ہیئت ترکیبی میں ایک جزو لاینفک کے طور پہ رکھ دیے گئے ہیں ۔ چنانچہ ان کمالات کا موجد دراصل وہی ہے جو اِن حیوانات کا موجد ہے ۔ ہم اُسے جاننے سے قاصر ہیں ۔ بلا البتہ بندر کی بعض نسلیں ایسی ہیں جن سے بعض حقیقی آزادانہ ایجادات کا ظہور مسلّم ہے ۔ ایک ORANG - UTAN نسل کے بن مانس کو ایک بوری سے جھولن کھٹولا (HAMMOCK) بنانے کا خیال سوجھ گیا اور اُس نے بغیر کسی کے بتلائے اُسے عملی شکل بھی دے ڈالی ۔ تاہم جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ان باتوں سے انسان اور حیوان کا امتیاز ماند نہیں پڑتا ۔ (باقی)

رسائل ومسائل

جانوروں کی حلّت وحرمت

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال:- براہ کرم قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں کچھ ایسے اصول وضوابط بتلائیں جن کی مدد سے جانوروں، بالخصوص پرندوں کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے۔ نیز اس ضمن میں یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ بگلا، کوئل اور پیلی چونچ اور پیلے پنجوں والی بڑی مینا (جسے پنجابی میں شارک کہتے ہیں) حلال ہیں یا حرام۔

جواب:- (از ملک غلام علی) قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں بعض جانوروں کی حرمت وحلّت کے بارے میں صراحت موجود ہے، نیز ایسے قواعد وضوابط بھی بیان فرمادیے گئے ہیں جن کی روشنی میں بقیہ جانداروں کو حلال یا حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید میں مُردہ جانور اور خنزیر کے حرام ہونے کی تصریح ہے اور حلال جانوروں کے لیے ایک اصول فرمایا گیا ہے۔

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ (المائدہ ۱) — تمہارے لیے مویشی قسم کے چرنے والے جانور حلال کیے گئے ہیں۔

اس آیت میں مواشی یا ان سے ملتے جلتے چرندے حلال کیے گئے ہیں اور جو جانور درندہ اور گوشت خور ہوں، جو عادتاً گوشت کھانے کے لیے اپنے شکار کو مجروح ومقتول بنا کر اور چیر پھاڑ کر کھائیں وہ اس تعریف سے خارج ہوجاتے ہیں۔ صاحب تفہیم نے اس آیت کی جو جامع تفسیر فرمائی ہے وہ درج ذیل ہے:-

* اَنعام (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے اور بہیمہ کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ اَنعام تمہارے لیے حلال کیے گئے تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں اَنعام کہتے ہیں۔ لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ "مویشی کی قسم کے چرند چوپائے تم پر حلال کیے گئے" اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرند جانور اس کے دائرے میں آجاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں، یعنی جو کچلیاں نہ رکھتے ہوں۔ حیوانی غذا کے بجائے نباتاتی غذا کھاتے ہوں۔ اور دوسری حیوانی خصوصیات میں اَنعامِ عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اس اشارے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے ان پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے خاص طرح کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے کھاتے ہیں یا مُردار خور ہوتے ہیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع وکل ذی مخلب من الطیر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کچلیوں والے درندوں اور مڑے ہوئے پنجوں سے شکار کرنے والے تمام پرندوں (کو کھانے) سے منع فرمایا ہے۔

دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔"

فقہائے حنفیہ نے قرآن وحدیث کے اس اصول کو منطبق کرتے ہوئے جن حیوانات کو درندہ شمار کرتے ہوئے اُن کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: شیر، بھیڑیا، چیتا، تیندوا، لومڑی، بلی، کتا، ریچھ، گیدڑ اور گلہری، اور پالتو گدھے کتے اور بلی کی حرمت اور خرگوش کی حلت کا ذکر احادیث میں بھی موجود ہے۔ لومڑی احناف کے نزدیک حرام ہے۔

مسلک حنفی کے عام فتوے کے مطابق باز، شکرہ، گدھ، شاہین، چیل حرام پرندوں میں شامل ہیں۔ لگا، طوطا، مینا (شارک) فاختہ، تیتر، چڑیا، ابابیل، نیل کنٹھ، ہُدہُد، بُلبُل، چنڈول، بیا، حنفیہ کے نزدیک حلال ہیں کیونکہ یہ عادتاً شکاری اور گوشت خور جانور نہیں۔ نہ پنجوں سے جانور پر جھپٹتے اور اُسے چیرتے پھاڑتے ہیں۔ کوئل کی (جسے عربی، فارسی میں غالباً ہزار کہتے ہیں) حلت و حرمت کے متعلق کوئی تصریح کتابوں میں نہیں مل سکی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بُلبُل کے مانند ایک غیر شکاری پرندہ ہے اور اسے حلال ہونا چاہیے۔

کوّے کی حرمت و حلت کے معاملے میں بعض احناف نے اس کی اقسام بیان کرتے ہوئے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ قریب کے زمانے میں بھی یہ بحث تازہ ہوئی ہے اور بعض لوگوں نے مجمع عام میں عام دیسی کوا پکا کر کھانے کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہر قسم کا کوا حرام ہے۔ بخاری، مسلم و دیگر صحاح میں ارشادِ نبوی وارد ہے کہ "پانچ قسم کے جانور موذی و نامراد (فاسق) ہیں جنہیں حرم کے اندر اور باہر ہر جگہ قتل کیا جائے۔ کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کٹکھنا کتا۔ حلال جانور کو اس طرح بے دریغ مارنے کا حکم کیسے ہوسکتا ہے۔ اس میں قیل و قال کی گنجائش کیا ہے؟ سرزمینِ عرب میں ہمارے ملک کی طرح کا کوا عام پایا جاتا ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے اُسے کھائے جانے یا حلال قرار دیے جانے کا کوئی ذکر احادیث و آثار میں نہیں ملتا۔

بحری جانور کی حلت قرآن مجید میں اصولی طور پر بیان فرما دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ (آیت ۹۶) میں فرمایا گیا۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ۔

(تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا)

اگرچہ اس حکم کا تعلق اولاً حالت احرام سے ہے لیکن ظاہر ہے کہ جس جانور کا شکار کرنا اور اُسے کھانا حالت احرام میں بھی جائز اور حلال ہے۔ (جب کہ خشکی کا شکار اس حالت میں حرام ہے)۔ وہ دریائی اور آبی جانور مطلقاً حلال ہوگا۔ البتہ یہاں یہ مسئلہ

تفصیل طلب ہے کہ اس سے مراد کون کون سا جانور ہے۔ صید البحر کا اطلاق مچھلی پر تو یقیناً ہوتا ہے اور حدیث میں بھی اس کے بغیر ذبح حلال ہونے کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ سریہ الخبط کا واقعہ مشہور ہے کہ اس میں صحابہ کرام کو سمندر کی امواج و ہیل مچھلی (عنبر) ملی جس کا گوشت انہوں نے کھایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے بھی اسے تناول فرمایا۔ لیکن دوسرے جانوروں کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

حنفی مسلک کے مطابق آبی جانوروں میں صرف مچھلی یا پھر فقط وہ جانور حلال ہے جو مچھلی سے کلی مشابہت رکھتا ہو اور اسی کی طرح پانی میں تیرتا ہو۔ اس کے حق میں احناف کے دلائل یہ ہیں کہ قرآن مجید میں طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کیا گیا ہے اور مچھلی کے ماسوا دوسرے پانی کے جانور ایسے ہیں جن سے انسانی طبائع نفرت کرتی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے ایسے جانور کھائے ہوں، نیز ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبدالرحمن بن عثمان سے مروی ہے کہ ایک طبیب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈک مار کر دوا تیار کرنے سے منع فرمایا حالانکہ یہ آبی جانور ہے۔ جو مچھلی پانی کے اندر خود ہی مر کر اوپر تیرنے لگے اسے کھانا بھی حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، بالخصوص جب کہ وہ مچھلی مر کر الٹی تیر رہی ہو۔ البتہ کوئی مچھلی نہر یا دریا وغیرہ سے زندہ پکڑ کر کسی تنگ حوض یا برتن کے پانی میں ڈال دی جائے اور وہاں مر جائے وہ بلا کراہت حلال ہے۔ کیکڑا (سرطان) مینڈک، مگرمچھ، جھینگا وغیرہ کو خبائث میں شمار کرتے ہیں۔

۵۔ جہاں تک زمین پر رینگنے والے جانوروں اور حشرات الارض کا تعلق ہے انہیں بھی حنفیہ خبائث قرار دے کر حرام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سانپ، گرگٹ، چھپکلی، کچھوا ان کے نزدیک حلال نہیں۔

مطبوعات

بدیع الزمان سعید نورسی
مؤلف: ثروت صولت
ناشر: ادارۂ معارف اسلامی۔ کراچی
ملنے کا پتہ: البدر پبلیکیشنز۔ اردو بازار لاہور
قیمت: (پیپر بیک ایڈیشن) -/۲۱ روپے

اس دور میں احیائے اسلام کی متعدد تحریکات پاکستان، انڈونیشیا، مصر و دیگر عرب ممالک اور ترکیہ میں متوازی طور پر چل رہی ہے۔ تین بڑی تحریکوں میں سے ایک نورسی تحریک ہے جو کمالی ترکیہ کی مخالف دین تحریکِ "ترقی" کے توڑ کے طور پر نمودار ہوئی اور پھر خطرات سے گذرتی ہوئی ملک بھر میں پھیل کر ایک عظیم قوت بن گئی۔ اور آج اس کا پیغام ترکی کے در و دیوار سے سنائی دیتا ہے۔ اسی تحریک کے زیر اثر مغربیت و مادیت کی راہ پر دور تک گیا ہوا ترکی اپنے سابق دینی افکار و اطوار کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔ اور نہ صرف مسجدوں سے عربی زبان میں اذانوں اور خطبوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں بلکہ پارلیمانی سیاست کے ایوانوں میں بھی اسلامی رجحانات موج در موج نمودار ہیں۔

یہ تحریک استاد بدیع الزمان سعید نورسی مرحوم کی برپا کردہ ہے۔ جنہوں نے گلا گھونٹنے والے حالات میں بوریائے درویشی سے کام شروع کیا، دیہاتی عوام، نوجوان طلبہ، بڑی علمی و سیاسی شخصیتوں، مختلف مجالس اور اداروں تک اپنا پیغام و اثر پھیلایا۔ جلاوطنی کا دور دیکھا، عدالتوں میں پیشیاں ہوئیں، قید کاٹی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی نگرانی اور انتظامیہ کی زیادتیوں کا سامنا کیا۔ ۱۵۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو اتحادِ محمدی نامی جماعت کے بانیوں میں سعید نورسی بھی شامل تھے اور اس کا منشور یہ تھا کہ "یہ جماعت شریعت کی حکمرانی اور اتحاد کی علمبردار ہے"۔ اس کے متعلق استاذ کے صرف ایک مضمون سے آداپزاری اور ازمت کے ۵۰ ہزار افراد اس جماعت میں شامل ہوئے۔ پھر اپنی دعوت کو پھیلانے کے

لیے انہوں نے بڑی جانفشانیاں کی ہیں۔ خاص طور پر قرآنی مضامین پر مشتمل رسائل نور کا جو سلسلہ انہوں نے پھیلایا، وہی دراصل نوری یا نورسی تحریک کے لیے ریڑھ کی ہڈی بنا۔ پریس میں یہ رسائل چھپ نہ سکتے تھے۔ علامہ نورسی سے متاثر نوجوان ان کو قلم سے لکھتے اور آگے کچھ اور لوگوں کو تفویض کر دیتے۔ پھر نقل در نقل کا یہ سلسلہ کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ حتیٰ کہ اُن کے شاگردوں نے جیل میں بھی نظر بچا کر یہ خدمت جاری رکھی اور ہر جیل میں استاذ سے قیدی متاثر ہو کر تائب ہو گئے۔ خیر یہ لمبی داستان تو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کتاب کو ترکی سے اُردو میں منتقل کرنے کا سہرا نوجوان صاحبِ قلم ثروت صولت کے سر بندھتا ہے۔ انہوں نے پہلے ترکی زبان خود آموزی کے طور پر سیکھی اور پھر ہمارے دیرینہ ترکی رفیق و دوست اعظم ہاشمی مرحوم —— جو روسی ترکستان سے زندہ بچ نکلنے والے ایک معزز گروہ علما سے تعلق رکھتے تھے اور دارالاسلام میں مولانا مودودی کے ساتھ چند سال رہ چکے تھے —— کی ترکی زبان کی چند کتب کے بل پر جو ادارۂ معارف اسلامی سے دستیاب ہوئیں، متذکرہ کتاب مرتب کی ہے جو علامہ سعید نورسی کی سوانح بھی ہے اور نوری تحریک کی رپورٹ بھی!

یاد رہے کہ مستقبل کے لیے تحریک اسلامی کا بہترین با صلاحیت عنصر پاکستان سے باہر مصر، ترکیہ اور یا پھر ملائشیا انڈونیشیا سے اُبھر رہا ہے۔

مجلہ "محور" ۱۹۶۷ء
پیشکش: پنجاب یونیورسٹی یونین
مدیر: سلیم منصور خالد ایم اے فائنل
مشیر: پروفیسر مسکین حجازی

"محور" پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا مشہور مجلہ ہے جو سالنامہ کے طور پر شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا کی خدمت میں مبارکباد کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اُن کے زیر سایہ کام کرنے والی سٹوڈنٹس یونین نے محور کا ایک ایسا ایڈیشن پہلی بار پیش کیا ہے جو بڑے تنوع کے ساتھ ٹھوس فکر انگیز مواد

اور لطیف ادبی نگارشات کا ایک عظیم ذخیرہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ملک میں اسلامی نہج پر تعلیمی انقلاب لانے کے لیے برسوں سے معاشرے میں جو افکار و جذبات نشو ونما پا چکے ہیں، ان کی پوری پوری جھلک اس میں موجود ہے۔ کہنا چاہیے کہ طلبہ و اساتذہ ہی کے لیے نہیں، علمی ادبی حلقوں کے لیے بھی اور ان سے بڑھ کر تعلیمی مفکروں اور ملک کے کارپردازوں کیلیے بھی محور کی یہ اشاعت بہت اہم ہے۔

مسئلہ تعلیم کو اسلامی اور پاکستانی نظریے کی روشنی میں دیکھنے کی بہت اچھی کوشش ہے مستقبل کے نصابی خاکوں اور پروگراموں کے لیے اس میں رہنمائی موجود ہے۔ بہت سی نگارشات ممتاز مشاہیر کی کاوشوں کا ماحصل ہیں۔ نوجوان طلبہ کی آرا کا انعکاس بھی اس میں ملتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی داستانِ خونچکاں کے چند اوراق بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ مشرقی پاکستان کے شہادت یافتہ طالب علم عبدالمالک کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ تحریک "البدر" پر تفصیلی مضمون بھی پیش کیا گیا ہے۔

محور کی قائم کردہ اس اچھی مثال کو پیشِ نظر رکھ کر اگر لا کالجوں، میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ اور فنونِ لطیفہ سے متعلق کالجوں بلکہ دینی مدارس کی طرف سے بھی اگر محنت سے مرتب کیے ہوئے ایسے تعمیری مجلّے پیش کیے جانے لگیں تو نہ صرف زیرِ تعلیم طلبہ کے ذہنوں کی بہتر نشو ونما میں ان سے مدد ملے گی، بلکہ مجموعی طور پر معاشرے کے مطالعہ پسند حلقوں تک ان کا مفید اثر پہنچے گا۔

جگہ کی کمی کی وجہ سے مجلّہ کے مضامین و مباحث کا تفصیلی مطالعہ و تجزیہ نہیں کیا جا سکا اور نہ لکھنے والوں کی وسیع محفل میں شامل ہونے والوں کا تعارف کرانا ممکن ہوا۔

ترتیب کے علاوہ کتابت و طباعت میں محنت و کاوش کی گئی ہے اس کا خراجِ تحسین ہم جناب پروفیسر مسکین حجازی کے واسطے سے نوجوان ایڈیٹر سلیم خالد منصور تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) بغل میں لیا اور یہ کہہ کر چل دے کہ اب نہ میرا مرغ یہاں بانگ دے گا، نہ صبح ہو گی، پڑے سوتے رہو۔

خدا اور رسولؐ کے عطا کردہ عظیم الیقین کی خدمت کرنے والے یوں نہیں کیا کرتے۔ ان کے حوصلے بلند اور ظرف وسیع ہوتے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سے اختلاف کی بنا پر دوسروں سے کٹتے نہیں، بلکہ سب کے ساتھ مل کر چلتے ہیں ؏

راہ حق با کاروان رفتن خوش است

آپ کی اصل حریف قوت الحاد اور مادہ پرستی کی بنیادوں پر قائم شدہ تہذیب ہے جس کے عالمگیر سیلاب کی موجیں اور تو اور، خود آپ کے گھروں اور آپ کی مسجدوں اور آپ کی تنظیموں تک میں داخل ہو رہی ہیں اور اگر انہیں آپ دوسروں کے تعاون سے روکنے کی جان توڑ مہم کے بجائے کون سنی ہے اور کون سنی نہیں، کون محب رسالت ہے اور کون توہین رسالت کا مرتکب، انہی بحثوں میں لگے رہے تو مذہبیت کا پورا ایوان خدانخواستہ زمین بوس ہو جائے۔ خدا را کچھ سبق سمرقند و بخارا کی داستانِ خونچکاں سے لیجیے۔

تفہیم القرآن

پارۂ اوّل ــــ سورۃ الفاتحہ والبقرہ ــــ سورۃ التوبہ ــــ سورۃ الفرقان
سورۃ العنکبوت ــــ سورۃ لقمان ــــ سورۃ الاحزاب ــــ سورۃ یٰسٓ
سورۃ الفتح ــــ سورۃ الحجرات ــــ اور ــــ سورۃ الرحمٰن ــــ کے بعد

تفسیر تیسواں (۳۰) پارہ

ادارہ ترجمان القرآن کے روایتی معیار کے
مطابق شائع کیا گیا ہے۔ آج ہی آرڈر بک کرائیں

○

ولایتی کاغذ ــــ آفسٹ طباعت ــــ خوبصورت کور

سائز: $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$

○

ہدیہ: بیس (۲۰) روپے

○

ادارہ ترجمان القرآن ○ اچھرہ، لاہور